دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۳ ماہ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۱۴ء عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات	۲
اشتیاق احمد ظلی	
مقالات	
قتل عمد میں قصاص اور دیت ہے، معافی نہیں	۵
الطاف احمد اعظمی	
علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت	۲۵
پروفیسر اختر الواسع	
فن تاریخ گوئی میں علمائے باقیات کا حصہ	۳۸
ڈاکٹر راہی فدائی	
قیام امن سے متعلق عیسائیت کی تعلیمات اسلام کے تناظر میں	۵۸
ڈاکٹر تو قیر عالم فلاحی	
اخبار علمیہ	۷۲
ک، ص اصلاحی	
معارف کی ڈاک	
بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے چند اہم ہندوستانی قلمی سفرنامے	۷۵
عارف نوشاہی	
دارالمصنّفین اور مولانا مودودیؒ	۷۶
احمد سعید	
مطبوعات جدیدہ	۷۷
ع-ص	
رسید مطبوعہ کتب	۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

کچھ دنوں پہلے تک جنوبی افریقہ نسلی انتہا پسندی، انسانی حقوق کی پامالی اور ظلم واستحصال کے بدترین نظام کے لیے ایک علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔ نسلی علاحدگی پسندی کی اساس پر قائم ہونے والے اس نظام کو Apartheid کے نام سے جانا جاتا تھا۔ انسانیت کی تذلیل کے اس بدترین مظہر کو وہاں قانونی اور دستوری درجہ حاصل تھا۔ وہاں کے باشندے صدیوں سے اس ظلم وستم کے شکار تھے۔ اس سرزمین پر ۱۶۵۲ میں ڈچ طالع آزماؤں نے قدم رکھا۔ بعد میں یہاں جب ہیرے اور سونے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے تو یہ علاقہ یوروپی طالع آزماؤں کے درمیان شدید کشمکش کی آماجگاہ بن گیا اور اس خطہ پر تسلط قائم کرنے کے لیے کوششوں میں بہت تیزی آگئی۔ اسی کشمکش کا ایک مظہر بوئروں کے خلاف انگریزوں کی جنگ تھی جو Anglo - Boer War کے نام سے جانی جاتی ہے۔ پہلی بوئر جنگ ۸۱-۱۸۸۰ میں لڑی گئی۔ اس میں انگریز ناکام رہے۔ ۱۹۰۲-۱۸۹۹ کے درمیانی عرصہ میں دوسری بوئر جنگ لڑی گئی جس میں انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طرح یہ علاقہ تاج برطانیہ کے زیرنگیں آگیا۔ ڈچ اور برٹش قبضہ کے دوران نسلی علاحدگی پسندی اور نسلی بنیادوں پر استحصال کا نظام رائج رہا۔ اقتدار کا ارتکاز پوری طرح سفید فام اقلیت کے ہاتھ میں تھا اور سیاہ فام اکثریت کی اس میں کسی درجہ میں بھی ساجھے داری کی گنجائش نہیں تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے ۱۹۳۱ میں اس علاقہ کو خودمختاری دے دی۔ ۱۹۴۸ کے الکشن میں نیشنل پارٹی کی کامیابی نسلی انتہا پسندی کے تناظر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پارٹی کی حکومت میں نسلی علاحدگی پسندی کے نظریہ کو اسٹیٹ پالیسی کے طور پر اختیار کرلیا گیا اور ظلم، جبر، ناانصافی اور استحصال پر مبنی اس نظام کو دستوری اور قانونی حیثیت دے دی گئی۔ مقامی آبادی جس نوعیت کے نسلی تعصب کی شکار تھی عہد حاضر میں اس کی مثال صرف اسرائیل میں ملتی ہے جہاں عملاً وہی ظالمانہ نظام رائج ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کی اس پالیسی کے خلاف دنیا نے ایک سخت اور متحدہ موقف اختیار کیا تھا جب کہ سب نے اسرائیلی مظالم کے خلاف آنکھیں بند کررکھی ہیں۔ اس ظلم کے خلاف جدوجہد بھی ہوتی رہی لیکن وہ بہت زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔ پھر اسی خاک سے ایک شخصیت اٹھی اور اس خطہ کے تاریک افق پر صبح امید بن کے طلوع ہوئی اور ظلم وجبر کے اس بدترین نظام کے خلاف جدوجہد کی علامت بن گئی۔ اس نے یہ ثابت کردیا کہ اگر انسان کے اندر اخلاق کی طاقت ہو، اگر اسے اپنے مقصد پر اذعان اور یقین کی دولت حاصل ہو،

اگر اسے عزم وحوصلہ کا حصہ وافر ملا ہوتو مشکل ترین حالات میں بھی کامیابی قدم چومتی ہے اور وہ منزل مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔عہد حاضر کے عظیم قائد نیلسن منڈیلا کی زندگی اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔غیر معمولی عزم و حوصلہ کی یہ داستان اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے اور اس سے سبق حاصل کیا جائے۔حالات کا بدترین جبر بھی اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ سجی رہنے والی مسکراہٹ کو چھیننے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔سیاسی قیادت کے ہمہ گیر بحران کے اس دور میں اس کی شخصیت تپتے ہوئے صحرا میں ایک شاداب نخلستان کی تھی۔یہی وجہ ہے کہ ۵ دسمبر کو جب اس نے اس جہانِ فانی سے رخت سفر باندھا تو جنوبی افریقہ کے اس درد کو پوری دنیا نے محسوس کیا۔

نیلسن منڈیلا ۱۸ جولائی ۱۹۱۸ کو جنوبی افریقہ کی ایک بستی قونو میں پیدا ہوئے۔ان کے والد اپنے قبیلہ کے سردار تھے لیکن ان کی کم عمری ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ابتدائی تعلیم کے بعد قانون کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔وطن عزیز کے حالات سے منڈیلا کے دل ودماغ کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔اس کے نتیجہ میں وہ اس کے خلاف برپا جدوجہد میں شریک ہوگئے اور افریکن نیشنل کانگریس کی یوتھ ونگ میں شمولیت اختیار کرلی۔۱۹۶۱ میں مسلح بغاوت کے الزام میں گرفتار کیے گئے۔اس مقدمہ میں انہوں نے اپنا دفاع خود کیا۔عدالت میں ان کی تاریخی تقریر چار گھنٹہ تک چلتی رہی۔ظلم وجبر کے ایوانوں میں اس کی گونج مدتوں سنائی دیتی رہی۔اس میں انہوں نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ وہ اس مقصد کو پورا ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ رہیں گے۔لیکن اگر اس کے حصول کی راہ میں ان کو اپنی زندگی کا نذرانہ بھی پیش کرنے کی ضرورت پڑی تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کریں گے۔اس مقدمہ میں ان کو سزا ہوگئی اور وہ جزیرہ رابن میں قید کردیے گئے۔جنوبی افریقی کے حریت پسندوں کے لیے اس جزیرہ کی وہی حیثیت تھی جو ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے لیے کالا پانی کی۔دور حاضر کے کسی سیاسی قیدی کی یہ سب سے طویل قید تھی۔جب وہ قید کیے گئے تھے تو ان کی عمر ۴۴ سال تھی اور جب وہ ۱۹۹۰ میں رہا کیے گئے تو وہ اپنی عمر کی ۷۱ منزلیں طے کرچکے تھے۔ان کی قید کے دوران پوری ایک نئی نسل تیار ہوگئی۔ان کو ایک کان میں پتھر توڑنے پر مامور کیا گیا۔اس دوران منڈیلا نے نہ جانے کتنی چٹانیں توڑ ڈالیں لیکن اس عہد کی طویل ترین قید کی یہ مشقت بھی ان کے عزم وحوصلہ کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔اور بالآخر اس ظالمانہ نظام کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔طویل اور مشکل مذاکرات کے بعد جو ۱۹۸۶ سے جاری تھے فروری ۱۹۹۰ میں ان کو جیل سے رہا کردیا گیا۔ان کے ہم وطنوں نے اپنے اس قائد کے استقبال کے لیے دیدہ ودل کو جس طرح فرش راہ کیا ہوگا اس کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

اپریل ۱۹۹۴ میں جنوبی افریقہ میں پہلے آزادانہ الکشن کا انعقاد ہوا اور ایک بڑی اکثریت سے منڈیلا

صدر منتخب کر لیے گئے۔ ۱۰ مئی ۱۹۹۴ کو انہوں نے جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ یہ ان کی قائدانہ صلاحیت کا بہت سخت امتحان تھا۔ ملک کی ۸۰ فی صد آبادی سیاہ فام تھی جو ایک مدت دراز سے شدید ترین مظالم اور استحصال کی شکار رہی تھی۔ سفید فام اقلیت نہ صرف یہ کہ ملک کے تمام وسائل پر قابض تھی بلکہ اس نے یہاں کے باشندوں کو انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بنایا تھا۔ ایسی صورت حال میں سیاہ فام اکثریت کے دل و دماغ میں جذبہ انتقام کا پیدا ہونا اور سفید فام اقلیت کے اندر خوف و ہراس اور مستقبل کی طرف سے مایوسی کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ بحیثیت صدر منڈیلا کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جنھوں نے ان کو بدترین مظالم کا نشانہ بنایا تھا اور ان کے ساتھ مل کر ملک کے مستقبل کی تعمیر کریں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سفید فام اقلیت کو انہوں نے حوصلہ دیا اور ان کے اندیشوں کو دور کیا۔ حکومت سازی میں انہوں نے ہر طبقہ کے نمائندوں کو شریک کیا۔ ڈی کلرک کو جس سے انہوں نے صدارت کا چارج لیا تھا اپنا اول نائب صدر مقرر کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا لیکن منڈیلا کی قائدانہ بصیرت اور اخلاقی ساکھ نے یہ کارنامہ کر دکھایا اور ظالم اور مظلوم دونوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ متحد ہو کر ملک کے مستقبل کو سوارنے میں اپنا کردار ادا کریں، بالکل ایسے ہی جیسے یکسر مختلف اور متضاد رنگ مل کر قوس قزح کی حسین صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے جنوبی افریقہ کو قوسِ قزح قوم (Rainbow Nation) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قومی مصالحت کے اس عمل کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسے سچائی اور انصاف کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے افریقی چرچ کے مشہور رہنما ڈیسمنڈ ٹوٹو کی قیادت میں Truth and Reconciliation Commission قائم کیا تا کہ معافی اور انصاف کے درمیان صحیح توازن قائم کیا جا سکے۔ ۱۹۹۹ میں اپنا پہلا دور صدارت ختم ہونے کے بعد انہوں نے دوبارہ صدر بننے سے انکار کر کے ایک اور قابل تقلید مثال قائم کی۔ وہ دنیا بھر میں ظلم و جبر کے خلاف جد و جہد کی علامت بن گئے۔ جنوبی افریقہ میں ان کی حیثیت بابائے قوم کی تھی۔ چنانچہ ان کا انتقال اس ملک کے لیے ایک بڑا قومی سانحہ تھا۔ دس دن کے قومی سوگ کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اس سانحہ پر شدید رنج و غم کے ساتھ ان کے کارناموں پر بجا طور پر فخر اور مسرت کا جذبہ بھی شامل رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں اور وسیع تر عالم انسانیت کے لیے جو گراں قدر ورثہ چھوڑا ہے اس کا ان کو بھرپور احساس بھی ہے اور اس پر بے پایاں فخر بھی۔ ان کا سوگ پوری دنیا میں منایا گیا۔ ان کی تعزیت کے لیے جتنے عالمی قائدین اور رہنماؤں نے جنوبی افریقہ کا سفر کیا اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ کتنا جی چاہتا ہے کہ ہمارے درمیان بھی ایسے لوگ ہوتے۔ اس کا سب سے زیادہ حق تو رحمۃ للعالمینؐ کے پیرووں ہی کو پہنچتا ہے۔

مقالات

قتلِ عمد میں قصاص اور دیت ہے، معافی نہیں

الطاف احمد اعظمی

(۲)

نسخ کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ہر قوم کو جو شریعت دی جاتی ہے وہ اس کی عادات ونفسیات اور اس دور کے سماجی اور تمدنی حالات کے مطابق ہوتی ہے اور اسی کی اقامت اس سے مطلوب ہوتی ہے (دیکھیں سورۂ مائدہ، آیات ۴۴ تا ۴۷)۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو ان کی اپنی شریعت کی اقامت کا حکم دینے کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَمُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنۡ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَآ اٰتٰىكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ

(مائدہ:۴۸)

اور (اسی طرح اے نبی امی) ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق بھیجی ہے جو اپنے سے قبل موجود کتاب (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ ہے۔ پس تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کرو اور حق سے ہٹ کر جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی 'اہوا' (یعنی من گھڑت شریعت) کی پیروی نہ کرو۔ (اس بات کو یاد رکھو کہ) ہم نے تم میں سے ہر ایک (مذہبی گروہ) کے لیے ایک شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا (یعنی سب قوموں کی شریعت اور

آر زیڈ ۱۰۹ بی، گلشن اپارٹمنٹ، فلیٹ نمبر ۴۰۲، گلی نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹینشن، نئی دہلی -۱۹۔

طریقۂ عمل ایک جیسا ہوتا) لیکن اس نے (ایسا
نہیں کیا بلکہ) چاہا کہ جو شریعت اس نے تمہیں
دی ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے ۔ لہٰذا
(ظاہر شریعت میں فرق کی وجہ سے باہم جھگڑا
کرنے کے بجائے) نیکی اور بھلائی کی باتوں
میں (جو مقصود شریعت ہے) سبقت کرو''۔

مذکورہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف طور پر حکم دیا گیا ہے کہ وہ صرف اس شریعت کی اتباع کریں جو ان کے پاس بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے اور اہل کتاب کی خود ساختہ شریعت کی پیروی نہ کریں۔ معلوم ہوا کہ اہل ایمان (مسلمان) سابقہ شریعت کے مکلّف نہیں ہیں ۔ اگر سابقہ شریعت کے احکام محرف نہ ہوں یا ان کو اللہ نے منسوخ نہ کیا ہو تو بھی وہ احکام اسلامی شریعت کے احکام نہیں ہوسکتے ہیں۔ چونکہ ہر شریعت جیسا کہ اس سے پہلے لکھا گیا، اپنے عہد کے سماجی اور تمدنی حالات کے تابع ہوتی ہے اس لیے کسی دوسری قوم پر جس کے تمدنی حالات مختلف ہوں اس کو منطبق نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات فراموش نہ ہو کہ اسلامی شریعت کے علاوہ جو ہر دور کے لیے ہے اور ہر پہلو سے کامل ہے، وہ دوسری تمام شریعتیں نامکمل ہیں۔ اس کی ایک مثال خود قتل عمد کی سزا ہے۔ موسوی شریعت میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، قصاص اور معافی ہے۔ اس کے برعکس عیسوی شریعت میں صرف معافی ہے۔ اسلامی شریعت نے اس شرعی ناتمامی کو اس طرح دور کیا کہ قتل عمد کی سزا قصاص اور شاذ حالات میں دیت مقرر کی گئی اور قتل خطا میں دیت اور معافی۔ اس مکمل اور محفوظ شریعت کی موجودگی میں کسی ناتمام یا محرف شریعت پر عمل کرنا بڑی نادانی کی بات ہوگی۔ حیرت ہے کہ بہت سے علماء و فقہاء سے یہ امور کیوں کر مخفی رہ گئے۔

صحابۂ کرام اور تابعین عظام: جناب بدر احمد مجیبی صاحب نے قتل عمد کی سزا سے متعلق کئی صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال نقل کر کے بتایا ہے کہ یہ سب اہل علم و تقویٰ قتل عمد میں معافی کو درست سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ صحابہؓ اور تابعینؒ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۷۸ اور ۱۷۹ سے جن

میں قتل عمد کی سزا کا واضح ذکر ہے، بے خبر تھے۔اس کے علاوہ یہ بھی ماننا ہوگا کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا اور اس کا ذکر ہو چکا ہے، اس میں صاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ قتل عمد میں دو میں سے ایک چیز ہے، قصاص یا دیت، اس بات سے بھی یہ اصحاب علم و نظر ناواقف تھے۔اس بات کو کون مسلمان تسلیم کرے گا۔ یہ حضرات خیار امت کا درجہ رکھتے تھے۔ان صلحاء پر یہ اتہام رکھنے کے بجائے کہ وہ قتل عمد میں معافی کو جائز سمجھتے تھے، زیادہ بہتر ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ ان کی طرف منقول اقوال درست نہیں ہیں۔ہم ایک لمحہ کے لیے بھی تصور نہیں کر سکتے کہ اصحاب رسولؐ اور ان کے تربیت یافتہ اصحاب علم یعنی تابعین قرآن اور سنت کے ایک منصوص حکم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

مسالکِ اربعہ: اپنے مضمون کے آخر میں جناب بدر احمد مجیبی صاحب نے ائمۂ اربعہ کا مسلک بیان کیا ہے۔ جہاں تک فقہ مالکی کا تعلق ہے اس میں جس عفو کا ذکر ہے اس کا تعلق اس مجروح شخص سے ہے جو مرنے سے پہلے قاتل کو معاف کر دینے کی وصیت کر دے (دیکھیں، موطا، باب العفو عن قتل العمد)۔اس سلسلے میں علامہ ابن عبدالبر قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

ومن عفا عن جرح جرحه ثم مات وقال ان مت من هذا الجرح فقد عفوت صح عفوه ولم يتبع الجاني بشيئى ، هذا هو المشهور عن مالک ۔(۱۳)	جس شخص نے اس جراحت کو معاف کر دیا جو اسے لگائی گئی تھی اور کہا کہ اگر اس جراحت کی وجہ سے میری وفات ہو جائے تو میں نے اسے (یعنی جارح کو) معاف کر دیا تو اس کا معاف کرنا (ازروئے شریعت) صحیح ہوگا اور قاتل سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ امام مالکؒ کا یہ معروف مسلک ہے۔

مزید برآں اصحاب ظاہر کا مشہور اور معمول بہ مسلک یہ ہے کہ قتل عمد میں دو چیزوں میں سے ایک واجب ہوتی ہے، قصاص یا دیت۔(۱۴)

فقہ حنفی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ان مسالک میں قصاص اور دیت کے علاوہ معافی بھی ہے۔ ہمارے دل میں امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ)، امام شافعیؒ (م

۲۰۴ھ) اور امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کا بڑا احترام ہے اور ان کے علم و آگہی کا بھرپور اعتراف بھی لیکن وہ بہرحال معصوم عن الخطا نہیں تھے۔ راقم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ ان اصحاب علم نے قتل عمد سے متعلق سورۂ بقرہ کی آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی خطبہ کے باوجود جس کا ذکر صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ہے، کیوں کر یہ بات لکھ دی کہ قتل عمد میں ولی مقتول کو قصاص اور دیت کے علاوہ معاف کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔ اس لیے ماننا ہوگا کہ ان مسالک ثلاثہ میں معافی کی بات از قبیل تاویل ہے، جیسا کہ سورۂ اسراء (آیت ۳۳) میں لفظ 'سلطان' اور سورۂ شوریٰ (آیت ۴۰) میں لفظ 'سیئة' کی تاویلات سے بالکل واضح ہے اور ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ یہ بات ہر حال میں ملحوظ رہے کہ نصوص قرآن کی وہی تاویل صحیح سمجھی جائے گی جو سیاق کلام اور نظائر قرآن سے معنوی مطابقت رکھتی ہو۔

اہل علم جانتے ہیں کہ فقہ حنفی کا بڑا حصہ قیاسی احکام پر مشتمل ہے۔ راقم کے خیال میں حنفی علماء و فقہاء نے احادیث سے کم ہی رجوع کیا ہے۔ انھوں نے صحیح حدیث کی موجودگی میں قیاس کو ترجیح دی ہے۔ اس کی ایک مثال وجوب زکوٰۃ ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حدیث قابل ذکر ہے:

> ''حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ نہیں، پانچ اوقیہ (چاندی) سے کم میں زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق (غلہ و پھل) سے کم میں زکوٰۃ نہیں''۔ (۱۵)

موطا ہی میں ابو سعید خدریؓ سے ایک اور روایت ہے: **لیس فیما دون خمسة اوسق من التمر صدقة** (باب الزکوٰۃ)۔ صحیح مسلم میں ہے: **ولیس فی حب ولا تمرة صدقة حتی یبلغ خمسة اوسق** ''غلہ اور کھجور میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ مقدار میں پانچ وسق ہو''۔

لیکن اس واضح ہدایت کے باوجود امام ابو حنیفہؒ نے ہر قسم کی پیداوار میں خواہ کم ہو یا زیادہ، زکوٰۃ کو واجب قرار دیا ہے۔ یہی معاملہ دوسرے کئی قیاسی احکام کا ہے جو فقہ حنفی کا جزء ہیں۔

ایک مثال فقہ شافعی سے بھی پیش ہے۔ ایک شخص نے شادی کی لیکن نہ تو عورت کے ساتھ دخول ہوا اور نہ ہی اس کا مہر مقرر کیا گیا اور وہ مر گیا تو وراثت میں اس عورت کو کیا ملے گا؟

امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ وہ مہر مثل کے ساتھ وراثت میں بھی حقدار ہوگی۔ اور یہ چیز حدیث سے ثابت ہے (جامع ترمذی، ابواب الفرائض ، باب : ماجاء فی میراث المرأة من دية زوجها)۔ لیکن امام مالکؒ کی طرح امام شافعیؒ بھی اس حدیث کو صحیح نہیں مانتے کہ وہ مخالف قیاس ہے۔

دین کے مختلف امور و مسائل میں مسالک اربعہ کے درمیان شدید نوعیت کے اختلافات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ فلاں امام کا مسلک درست ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قتل عمد میں معافی کے متعلق امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ کا مسلک صحیح ہے اور امام مالکؒ کا مسلک جو تعامل اہل مدینہ پر مبنی ہے، غلط ہے اور اصحاب ظاہر بھی غلطی پر ہیں۔

مسلم قوم کا المیہ یہ ہے کہ وہ نظری طور پر قرآن اور اسوۂ رسول کو حق کی کسوٹی مانتی ہے لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو زیادہ تر نظر قرآن اور اسوۂ رسول کی طرف اٹھنے کے بجائے مسالک اربعہ میں سے کسی ایک مسلک کی طرف اٹھتی ہے اور اسی کو درست مان کر اختیار کر لیتے ہیں گویا کہ وہ وحی الٰہی ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فلاں امام کی فلاں بات اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق نہیں ہے تو اس مسلک سے وابستہ مسلمان کہتے ہیں کہ کیا اس مسلک کے جید علماء وفقہاء قرآن وسنت کو نہیں سمجھتے تھے؟

یہ کم اندیش لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ حاملین تورات بھی اپنی قوم کے عالم لوگ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے دیدہ ودانستہ توریت کے بہت سے احکام میں تبدیلی کر دی۔ اس کی ایک مثال قتل عمد ہے۔ انہوں نے اس معاملے میں اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اللہ کے حکم کو بدل دیا۔ پھر مسلمان اس خوش گمانی میں کیوں مبتلا ہیں کہ ان کے علماء وفقہاء (مستثنیات سے قطع نظر) اس خطا کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

اس بات کا کون منکر ہوسکتا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں جھوٹی حدیثیں گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلا دی گئیں اور اہل بدعت اور دنیا پرست علماء انہی جھوٹی حدیثوں کو سنا کر مسلمانوں کو برابر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ حق گو علماء نے اس چیز کا اعتراف کیا ہے کہ بے شمار جھوٹی حدیثیں ہمارے مذہبی لٹریچر کا جز بن چکی ہیں۔ مولانا عبدالحئی حسنیؒ لکھتے ہیں:

ان الکتب الفقهیة وان کانت معتبرة فی انفسها بحسب المسائل الفروعیه وکان مصنفوها ایضًا من المعتبرین و الفقهاء الکاملین ، لا یعتمد علی الاحادیث المنقولة فیها اعتمادا کلیا ولا بجزم بورودها وثبوتها قطعا بمجرد وقوعها فیها، فکم من احادیث ذکرت فی الکتب المعتبرة وهی موضوعة مختلفة ۔(۱۷)

فقہی کتابیں فروعی مسائل کے اعتبار سے اگر چہ معتبر ہیں ، ان کے مصنف بھی معتبر اور کامل فقہاء میں سے تھے مگر ان میں منقول احادیث پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ان کتابوں میں کسی حدیث کے درج ہونے سے اس کی صحت وثبوت کا یقین نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ کتنی ہی حدیثیں معتبر کتابوں میں مذکور ہیں، حالاں کہ وہ موضوع ہیں اور ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام مسلم نے اپنی 'صحیح' کے مقدمہ میں یحییٰ بن سعید کا یہ مقولہ نقل کیا ہے ''صالحین کو ہم نے حدیث میں زیادہ جھوٹ بولنے والا پایا ہے''۔ایک قول یہ بھی ہے کہ صوفیہ کسی چیز میں اتنا جھوٹ نہیں بولتے جتنا کہ انہوں نے حدیث میں دروغ گوئی کی ہے۔اس کی توجیہ امام مسلم نے یہ کہہ کر کی ہے کہ ''یجری الکذب علی لسانهم ولا یعتمدون الکذب'' (ان کی زبان سے جھوٹ نکل جاتا ہے، وہ عمداً ایسا نہیں کرتے)۔امام نوویؒ کی توجیہ بھی ملاحظہ ہو ''**وذلک لکونهم لا یعانون صناعة اهل الحدیث فیقطع الخطاء فی روایتهم ولا یعرفون ، ویروون الکذب ولا یعلمون انه کذب**'' (۱۸)(اہل حدیث کی طرح یہ لوگ حدیث کے فن میں محنت نہیں کرتے اس لیے وہ نادانستہ طور پر روایت بیان کرنے میں خطا کر جاتے ہیں، وہ جھوٹ روایت کرتے ہیں لیکن اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے)۔

یہ دروغ گوئی صرف ان احادیث تک محدود نہیں ہے جو اہل تفسیر اور علماء وفقہاء کی کتابوں میں درج ہیں یا جن کے راوی صوفیائے کرام ہیں بلکہ حدیث کی معروف کتابوں میں بہت سی موضوع روایتیں موجود ہیں۔ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔

افسوس تو ان علماء کے حال پر ہے جو قرآن وسنت سے براہ راست اخذ واستفادہ کے بجائے اسلاف کی اندھی تقلید کرتے ہیں ۔ جناب بدر احمد مجیبی کی درج ذیل تحریر جو ان کے مضمون

کا آخری حصہ ہے، ملاحظہ ہو:

''اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو خاص کر اس کی آیات احکام کو احادیث نبویہ کے بغیر محض اپنی عقل ناقص کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کرنے کا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔(اشارہ ہے راقم کے مراسلے کی طرف)......شریعت کے احکام کو مجتہدین حضرات نے بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کو اللہ نے اجتہادی شان عطا فرمائی تھی، وہ عربی زبان پر مکمل مہارت، قرآن وحدیث پر پوری نگاہ، صحابۂ کرام کے اقوال سے واقفیت، خوف وخشیت الٰہی اور عبادت میں خشوع و خضوع جیسی نادر صفات کے حامل تھے۔ان سے اللہ نے احکام شریعت کی تدوین وتحقیق کا کام لیا۔وہ ہماری موجودہ صلاحیت اور عقل وفہم کے معیار سے بہت بلند تھے''۔(معارف دسمبر ۲۰۱۲ء، ص ۴۲۴)

کیا قرآن مجید مجمل ہے؟: مذکورہ اقتباس کی پہلی سطر سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ جناب بدر احمد مجیبی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجمل ہے اور احادیث کے بغیر اس کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن غیر واضح ہے حالاں کہ خود اسی کتاب میں جگہ جگہ اسے ''کتاب مبین'' کہا گیا ہے یعنی وہ کتاب جس کے مضامین بالکل واضح اور قابل فہم ہیں، اس میں کسی نوع کی ژولیدگی نہیں ہے (سورۂ زمر: ۲۸)۔قرآن میں تصریف آیات کے ذریعے سے ہر بات کو واضح کر دیا گیا ہے، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (سورۂ انعام: ۶۵)	دیکھو! ہم کس طرح آیات کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات سمجھ لیں۔

اسی سورہ میں آگے فرمایا ہے:

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (سورۂ انعام: ۹۸)	ہم نے آیات کو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیا ہے تاکہ وہ بات کو سمجھ لیں۔

یہی معاملہ آیات احکام کا ہے۔متعدد سورتوں میں آیات احکام کے ذکر کے بعد بالعموم یہ فقرہ ضرور آتا ہے:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ (مزید دیکھیں سورۂ بقرہ:۲۴۲،آل عمران:۱۰۳، مائدہ:۸۹،سورۂ نور:۶۱) — اسی طرح اللہ اپنے احکام کو تمہارے لیے وضاحت سے بیان کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں بعض کلی احکام کے جزئیات نہیں بیان کیے گئے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان آیات احکام کا تعلق زمانہ کے احوال وظروف سے ہے جو برابر بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس طرح کے کلی احکام کی تفصیل کا کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کیا گیا، اور یہ کام آپؐ نے اپنے عہد کے حالات کے لحاظ سے بخوبی انجام دیا۔انہی تفصیلی احکام کو اصطلاحاً سنت کہا جاتا ہے۔اس کی ایک مثال حکم زکوٰۃ ہے۔اس کے مصارف سورۂ توبہ میں مقرر کر دیے گئے ہیں لیکن نصاب مقرر نہیں کیا گیا، اسی طرح کے چند کلی احکام کی عدم تفصیل کی بنیاد پر غالباً علماء نے یہ سمجھا کہ قرآن کا سمجھنا حدیث کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قرآن کلام مفصل ہے: کم نظر علماء کی غلط رہنمائی کی وجہ سے بہت سے مسلمان جن میں اہل علم کی ایک بڑی تعداد شامل ہے، سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن مجید کی تشریح فرمادی ہے اور وہ حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چند آیات کی تفسیر بیان فرمائی ہے(۱۹)۔اگر آپؐ نے پورے قرآن کی تفسیر کردی ہوتی اور وہ قرآن مجید ہی کی طرح محفوظ شکل میں امت تک منتقل بھی ہوگئی ہوتی تو پھر کسی بحث واختلاف کی گنجائش کہاں باقی رہتی۔ جملہ اہل ایمان اس کو حرز جاں بنالیتے اور وہی ایک چیز سب کے لیے مشعل ہدایت کا کام دیتی۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اس قدر اہم دینی کام سے صرف نظر کیوں کیا؟

غور سے کام لیں تو وجہ بالکل واضح ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تفسیر اس وجہ سے بیان نہیں کی کہ قرآن اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح ہے اور جہاں اجمال ہے اس کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر کردی ہے۔قرآن کی متعدد آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔بطور مثال چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

۱- الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ — الرٰ، یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات (باعتبار

فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (سورہ ہود:۱) — معانی و دلائل) محکم کی گئی ہیں پھر حکیم و خبیر خدا کی جانب سے اس کی تفصیل کی گئی ہے۔

۲- وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (سورۂ الفرقان:۳۳) — اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال تمہارے سامنے پیش کریں لیکن ہم اس کا مطابق حق اور نہایت واضح جواب تم کو عنایت کر دیتے ہیں۔

۳- اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (سورۂ انعام:۱۱۴) — کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو فیصلہ کرنے والا بناؤں؟ اور وہی ہے جس نے تمہاری طرف کتاب بھیج دی ہے جو پوری طرح مفصل ہے۔

۴- وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (سورۂ اعراف:۵۲) — اور ہم نے ان تک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کو ہم نے اپنے علم سے نہایت واضح اور مفصل بنایا ہے اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

آیات مذکورہ میں دو لفظ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ایک تفصیل اور دوسرا تفسیر۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ آخری کتاب کے معنی و مفہوم کی وضاحت خود نازل کتاب نے کر دی ہے۔ اس لیے ماننا ہوگا کہ وہ ایک مفصل اور مشرح کتاب ہے، اس کا مفہوم و مدعا بالکل واضح ہے، اس میں کہیں کوئی اشکال اور معنوی خفا نہیں ہے۔ اگر کسی مقام پر کوئی بات مجمل ہے تو دوسری جگہ وہ مفصل کر دی گئی ہے۔

یہ ساری تفصیل و شرح دراصل اس وعدہ کے مطابق ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں ان الفاظ میں آیا ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (آیت ۱۹) ''پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی تفصیل''۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تبیین کی نسبت تقریباً ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً:

۱- كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (سورۂ بقرہ:۲۴۲) — اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

۲- يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ — اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے (اپنے احکام)

يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (سورۂ نساء:۲۶)	بالکل واضح کردے اور تم کو ان (صالح) لوگوں کے طریقوں پر چلائے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔
۳- وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدَاهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُوْنَ (سورۂ توبہ:۱۱۵)	اللہ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی قوم کو ہدایت دینے اور اس پر راہ تقویٰ واضح کر دینے کے بعد گمراہ کردے۔
۴- يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (سورۂ نساء:۱۷۶)	اللہ تمہارے لیے (اپنے احکام کی) توضیح کرتا ہے کہ مبادا تم گمراہ ہوجاؤ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔
۵- وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (سورۂ بقرہ:۲۲۱)	اور وہ اپنی آیات کو لوگوں کے لیے وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔

اس بحث سے واضح ہوگیا کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب کی تبیین وتشریح خود کردی ہے۔ اس کام کو اس نے کسی اور کے سپرد نہیں کیا ہے کہ اس سے اختلاف فکر وعمل کے واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ علماء کا کام قرآن کی تفسیر وتوضیح کرنا نہیں جیسا کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ اللہ نے تصریف آیات کے ذریعہ کلیات دین کی جو وضاحت کردی ہے اس کو ٹھیک طرح سے سمجھنا اور پھر اس سے بندگان خدا کو آگاہ کرنا ہے۔

قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر تبیین کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ فرمایا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورۂ نحل:۴۴)	اور ہم نے تمہاری طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ جو چیز ان کی طرف نازل کی گئی ہے تم اس کو جوں کا توں ان سے بیان کردو۔

اس آیت سے علمائے کرام نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ قرآن کی تشریح وتفسیر فرمادیں۔ اس خیال کی غلطی اس بات سے ظاہر ہوجاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، چند ہی آیات کی تفسیر

مروی ہے۔ اگر علمائے کرام کی بات درست تسلیم کر لی جائے تو پھر ماننا ہوگا کہ آپؐ نے اس اہم فریضۂ نبوت سے چشم پوشی کی۔ اور اس بات کو کوئی مسلمان بقید ہوش وحواس ہرگز تسلیم نہ کرے گا۔

اس غلطی کی اصل وجہ مذکورہ آیت میں لفظ 'تبیین' کی غلط تشریح ہے۔ تبیین کے ایک معنی بے کم وکاست بیان کرنے کے ہیں اور یہ کتمان کی ضد ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ (سورۂ مائدہ:۱۵)	اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے۔ کتاب (یعنی تورات) میں سے جن باتوں کو تم چھپاتے ہو ان کو وہ تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر دیتا ہے اور بہت سی باتوں سے صرف نظر کر جاتا ہے جن کو تم چھپاتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ (سورۂ بقرہ:۱۵۹-۱۶۰)	جو لوگ چھپاتے ہیں ان باتوں کو جن کا تعلق دلائل واضحہ اور (امور) ہدایت سے ہے جب کہ ہم ان کو کتاب (یعنی تورات) میں لوگوں کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں مگر جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور ان باتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کریں (جن کو وہ اب تک چھپاتے رہے ہیں) تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کروں گا۔

'تبیین' کے دوسرے معنی توضیح کے ہیں یعنی کلام کو اس طرح بیان کرنا کہ منشائے کلام بالکل واضح ہو جائے، کہیں کوئی اشکال یا ابہام باقی نہ رہے۔ سورۂ بقرہ میں جہاں گائے کی قربانی کا ذکر ہے وہاں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ	انھوں نے (موسیٰ سے) کہا کہ آپ اپنے رب

(سورۂ بقرہ: ۶۸) سے درخواست کریں کہ وہ ہم کو واضح بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟

اسی معنی میں ایک دوسری جگہ آیا ہے:

وَمَـا اَرْسَلْنَـا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (سورۂ ابراہیم: ۴)

ہم نے جو رسول بھی کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اسی کی زبان میں تا کہ وہ (حق کو) ان کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردے۔

لفظ 'تبیین' کی اس تشریح کی روشنی میں غور کریں اور آیت کے سیاق وسباق کو بھی پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ سورۂ نحل میں یہ لفظ اول الذکر معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وحی کو بے کم و کاست بیان کرنا تا کہ مخاطب قوم اس کو پوری طرح سمجھ لے۔ اس لیے اس آیت سے اس بات پر استدلال کرنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ پورے قرآن کی تبیین تھی صحیح نہ ہوگا کیونکہ امہات دین کی تبیین خود اللہ نے کردی ہے جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف احکام مجمل کی عملی تبیین تھی۔

اس اصول کی روشنی میں غور کریں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی کہ صحاح ستہ کے تفسیری ابواب میں مرفوع احادیث کی تعداد کم کیوں ہے، اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معدودے چند ہی سوالات کیوں کیے؟ اس کی وجہ جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا (۲۰) ہے، یہ ہے کہ قرآن مجید انہی کی زبان اور اسلوب اور انہی کے احوال وظروف کے مطابق نازل ہوا تھا اس لیے اس کے معنی ومفہوم اور اس کے اطلاقات کو سمجھنے میں کوئی قابل ذکر دشواری حائل نہ تھی۔ اس کے علاوہ صحابہؓ کی ساری دلچسپی عملی مسائل سے تھی، نظری مسائل بالخصوص آیات متشابہات میں غور وخوض سے وہ مکمل طور پر اجتناب کرتے تھے۔

کسی شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے "یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة" میں "یوم" کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: فما یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة، "جو دن بھی ہو اس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے"۔ سائل نے کہا کہ میں نے اس کا مطلب دریافت کیا ہے۔ فرمایا: هما یومان ذکر هما الله فی کتابه، والله اعلم بهما (۲۱)

''یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اللہ ہی ان کو بہتر طور پر جانتا ہے''۔ امام طبری نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: **فکرہ ان یقول فی کتاب اللّٰہ مالا یعلم** (۲۲) ''انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ اللہ کی کتاب کے بارے میں وہ بات کہیں جس کا انہیں علم نہیں تھا''۔ طبری نے حضرت ابن عباسؓ ہی کے بارے میں ایک دوسری روایت نقل کی ہے کہ:

ان ابن عباس سئل عن آیت ، لو سُئل عنھا بعضکم یقال فیھا ، فابی ان یقول فیھا۔ (۲۳)

ابن عباس سے کسی آیت کے بارے میں پوچھا جاتا......اگر تم میں سے کسی سے پوچھا جاتا تو اس کے متعلق اپنی رائے ضرور ظاہر کر دیتا......تو اس کے متعلق کچھ کہنے سے انکار کر دیتے۔

سعید بن مسیّب کے بارے میں روایت ہے کہ: **انہ کان لا یتکلم الا فی المعلوم من القرآن** (۲۴) ''قرآن کی جو باتیں ان کو معلوم ہوتیں وہ صرف انہی کے متعلق گفتگو کرتے تھے''۔ انہی تابعی کے بارے میں ایک دوسری روایت ہے: **انہ کان اذا سئل عن تفسیر آیۃ من القرآن قال : انا لا نقول فی القرآن شیئا** (۲۵) ''ان سے جب قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو کہتے کہ ہم قرآن کے متعلق کچھ نہیں کہیں گے''۔

صحابہ صرف آیات احکام کے متعلق گفتگو کرنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ تابعی مذکور کے بارے میں روایت ہے کہ جب ان سے حلال وحرام کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ اس کو بتا دیتے لیکن کسی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو وہ اس طرح خاموش رہتے گویا سنا ہی نہیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:

کان نسئل سعید بن المسیب عن الحلال والحرام ، وکان اعلم الناس ، فاذا سئلناہ عن تفسیر آیۃ من القرآن سکت کان لم یسمع۔ (۲۶)

تفسیر قرآن کے باب میں صحابہ اور تابعین کے اس طرز عمل کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی تفسیر، احادیث سے کرنا صحیح ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کتب حدیث کے ابواب التفسیر میں مرفوع اور موقوف دونوں طرح کی روایتیں شامل ہیں۔ ان میں ضعیف روایتیں بھی موجود

ہیں، مثلاً 'تسع آیات' (بنی اسرائیل:۱۰۱) کو لیں۔ قرآن کی تصریح کے مطابق 'تسع آیات' سے یہ چیزیں مراد ہیں: عصا، ید بیضاء، قحط، نقص ثمر، طوفان، ٹڈی، جوں، مینڈک، خون (دیکھیں سورۂ اعراف: ۱۰۷، ۱۳۰، ۱۳۳)۔ لیکن ترمذی، مسند احمد، نسائی اور ابن ماجہ کی حدیث کے مطابق نو نشانیاں یہ تھیں: خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، حاکم کے پاس کسی معصوم کی چغلی نہ کھانا، سود نہ کھانا، پاک دامن عورت پر تہمت نہ لگانا، میدان جہاد سے نہ بھاگنا، سبت کے دن زیادتی نہ کرنا۔ (یہ دراصل تورات کے احکام عشرہ ہیں) ان احکام کو سن کر وہ یہودی جو آپ سے 'تسع آیات' کا مطلب دریافت کرنے آئے تھے نہایت خوش ہوئے اور آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔ (۲۷)

بعض روایتیں نص قرآن سے متعارض ہیں، مثلاً آیۂ تطہیر (احزاب:۳۳) سے متعلق حدیث۔ حضرت ابراہیمؑ کے جھوٹ بولنے کا قصہ بھی (صحیح بخاری) اسی زمرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ "وعلیھن درجة" (بقرہ:۲۲۸) سے متعلق حدیث بھی صریحاً نص قرآن سے متعارض ہے۔ روایت ہے کہ ایک عورت نے آنحضورؐ سے شکایت کی کہ اس کے شوہر نے اسے ایسا طمانچہ مارا ہے جس سے اس کے چہرے پر نشان پڑ گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "الرجال قوامون ......" گویا حدیث کے مطابق اس آیت نے مرد کو اختیار دے دیا کہ وہ قوام ہونے کی بنا پر عورت کو شدید طور پر مارنے کا حق رکھتا ہے۔ (۲۸) (استغفراللہ)

جہاں تک کتب تفسیر میں مندرج روایات کا معاملہ ہے تو ان کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا یہ فیصلہ ہے: ثلاثة امور لیس لھا اسناد ، التفسیر والملاحم والمغازی ۔(۲۹) "تین چیزوں کا اعتبار نہیں، ایک تفسیر، دوسرے ملاحم اور تیسرے مغازی"۔ اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے بھی ملاحظہ فرمالیں: والموضوعات فی کتب التفسیر کثیرة ۔(۳۰) "کتب تفسیر میں موضوع روایتوں کی کثرت ہے"۔

متذکرہ بالا حقائق کے باوجود تقلیدی ذہن کے علماء کہتے ہیں کہ صحاح ستہ بالخصوص صحیحین کے غیر تفسیری ابواب کی حدیثوں پر اس رائے کا اطلاق نہ ہوگا۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں

ہے۔صحاح ستہ کی احادیث کا بڑا حصہ جس میں صحیحین کی احادیث بھی شامل ہیں،اخبار آحاد پر مشتمل ہے اور تمام محقق علماء کے نزدیک،محدثین کو مستثنیٰ کر کے،اخبار آحاد مفید یقین نہیں یعنی ان سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف گمان غالب حاصل ہوتا ہے۔اس کے برخلاف قرآن مجید قطعی الدلالت ہے یعنی وہ یقینی ذریعۂ علم ہے اس لیے قطعی الدلالت کی تفسیر ظنی الدلالت چیز سے نہیں کی جاسکتی ہے۔جو لوگ حدیث کو کسی طور پر مفید یقین خیال کرتے ہیں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ قرآن اور صحیحین میں مذکور احادیث باعتبار یقین یکساں درجہ رکھتی ہیں۔اس لیے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ حتی الامکان قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ: **فان قال قائل ، فما احسن طریق التفسیر (فالجواب) ان اصح الطریق فی ذلک ان یفسر القرآن بالقرآن** (۳۱)۔''اگر کوئی پوچھے کہ تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ کیا ہے؟ (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے''۔

احادیث کی ظنیت اور موضوعیت کے علاوہ جس کا اوپر ذکر ہوا،بہت سی احادیث میں اختلاف وتناقض پایا جاتا ہے اور یہ چیز بھی ان کے اعتبار واستناد کو مجروح کرتی ہے۔اس سلسلے میں ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔حضرت عائشہؓ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر اللہ کے بجائے جبرئیل علیہ السلام کو ان کی خلقی صورت میں دیکھا تھا (صحیح بخاری،کتاب التفسیر،صحیح مسلم،کتاب الایمان)۔لیکن صحیح بخاری (کتاب التوحید) میں ایک دوسری روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا۔ترمذی اور نسائی میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں رب تعالیٰ کو دیکھا تھا۔

اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: **یا ایھا الناس انی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ : کتاب اللّٰہ** ۔''اے لوگو! میں نے تم میں وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگی،اور وہ چیز کتاب اللہ (یعنی قرآن) ہے''۔

لیکن موطا کی ایک روایت میں کتاب اللہ کے ساتھ "سنتی" کے الفاظ ہیں۔(۳۲) ایک اور مجموعہ حدیث 'المعجم الکبیر' (طبرانی) میں "سنتی" کے بجائے "عترتی" ہے یعنی اہل بیت۔(۳۳)

غرض یہ کہ کسی بھی دینی مسئلہ کے متعلق کوئی روایت دیکھ لیں اس کے بالمقابل ایک دوسری حدیث ضرور موجود ملے گی جو اس کی نقیض ہوگی۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ "ریشم اور سونا کا استعمال مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔(ترمذی، باب ماجاء فی الحریر والذهب)۔ لیکن ایک دوسری حدیث میں عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کے استعمال کی ممانعت آئی ہے۔(المعجم الکبیر، طبرانی، مزید دیکھیں مسند احمد، رقم الحدیث ۲۳۱۲۲)

حدیثوں کے اس اختلاف و تناقض اور ان کے ظنی ہونے کی وجہ سے ہی امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے حنفی علماء نے احادیث یعنی اخبار آحاد کو نا قابل اعتبار قرار دے کر رد کردیا۔ شیخ محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں:

والحق انا اذا استثنا الشافعی و احمد بن حنبل و فقهاء الظاهر الذین جاء وا من بعده ، نجد الفقهاء جمیعا من لدن عصر الصحابة الی آخر عصر الاجتهاد قد ترکوا اخبار الاحاد وردوا نسبتها الی رسول اللّٰه صلوٰت اللّٰه وسلامه علیه لمخالفتها لاصول ثابتة لدیهم قد اخذوا بالاستنباط من القرآن او المشهور من الآثار ۔(۳۴)	واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم امام شافعی، احمد بن حنبل اور ان کے بعد کے فقہاء ظاہر کو مستثنیٰ کردیں تو عہد صحابہ سے لے کر دور اجتہاد کے آخر زمانہ تک کے تمام فقہاء کو پائیں گے کہ انہوں نے احادیث (اخبار آحاد) کو ترک اور رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کو رد کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ حدیثیں ان کے اصول مسلمہ کے خلاف تھیں جن کو انہوں نے قرآن یا مشہور آثار سے بہ طریق استنباط اخذ کیا تھا۔

آگے انہوں نے مزید لکھا ہے:

فهم یاخذون بدلالات القرآن و مفهوم عباراته واشاراته	وہ قرآن کی دلالتوں، اس کی عبارات کے مفہوم اور اس کے اشارات کو لیتے ہیں اور اس صورت

ویترکون الاحادیث عند ذلک	میں احادیث کو ترک کر دیتے ہیں، اس کی وجہ
احتیاطا فی قبول الروایة	قبول روایت میں احتیاط اور نص قرآن کی جس
وترجیحا لنص قرآنی لا شک	کی صحت و صداقت مسلم ہے، روایت حدیث پر
فی صدقه علی روایة حدیث	ترجیح ہے جو محتمل صدق ہے (یعنی اس میں
محتمل الصدق۔(۳۵)	کذب کا بھی امکان پایا جاتا ہے)۔

امام سرخسیؒ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اخبار آحاد سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں وہ فرض ہوتے ہیں اور نہ واجب اور نہ ہی ان کا تارک مستوجب سزا ہے۔(لا یعاقب بترکها لانها لیست بفریضة ولا واجبة)۔(۳۶)

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس رسول خدا کی طرف اخبار آحاد (احادیث) کو منسوب کیا گیا ہے، خود اس ہادی برحق نے فرمایا ہے: من کتب عنی غیر القرآن شیئا فلیمحه (صحیح مسلم) ''جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے تو چاہیے کہ اس کو مٹا دے''۔ ترمذی میں ہے: لا تکتبوا عنی غیر القرآن شیئا ''قرآن کے سوا کوئی چیز مجھ سے سن کر نہ لکھو''۔ صرف انہی معدودے چند حدیثوں کے لکھنے کی اجازت دی گئی جن کا تعلق زکوٰۃ وغیرہ کے احکام سے تھا۔ مشہور صحیفۂ علی میں احکام صدقہ کی تفصیل درج تھی۔(۳۷)

اس ممانعت کے باوجود کچھ اصحاب نے حدیثوں کو اپنے الفاظ میں لکھا لیا تھا۔ تحریری طور پر الفاظ رسول کے محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے عہد صحابہ میں ہی اختلاف شروع ہو گیا تھا۔ اس اختلاف کو دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہد خلافت میں صحابہ کو مشورہ دیا کہ:

لا تحدثوا عن رسول اللّٰه شیئا ،	تم رسول اللہ سے منسوب کوئی بات بیان نہ کرو۔
فمن سألکم فقولوا بیننا وبینکم	تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو ہمارے اور تمہارے
کتاب اللّٰه (۳۸)۔	درمیان کتاب اللہ ہے (یعنی وہی کافی ہے)۔

بیان روایت میں صحابہ کے اسی اختلاف کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں حدیث کے مجموعے جلوا دیے تھے اور صحابہ کی مجلس میں ارشاد فرمایا: وانی واللّٰه لا اشوب کتاب اللّٰه بشئی ابدا (۳۹)۔ ''اور قسم ہے اللہ کی، میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری

چیز کے ساتھ ہرگز مخلوط نہ ہونے دوں گا''۔اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خلیفہ دوم صرف اس بات کے خلاف تھے کہ حدیثوں کو لکھا جائے۔وہ جہاں ان کی تسوید کے خلاف تھے وہاں زبانی بیان کرنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔اس معاملے میں دوراندیش خلیفہ راشد کی سختی کا حال یہ تھا کہ انہوں نے کثرت سے حدیثیں بیان کرنے والے تین جلیل القدر اصحاب رسول،ابن مسعودؓ،ابن ابی درداءؓ اور ابو مسعودؓ کو قید کردیا تھا۔(۴۰)

خلیفہ اول نے یہ کیوں فرمایا کہ ''اللہ کی کتاب ہمارے اور تمہارے درمیان (فیصلہ کے لیے کافی) ہے''۔اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ خلیفہ دوم نے حدیث کے مجموعے کیوں جلوا دیے؟ اور وہ کیوں اصحاب رسول کو حدیثیں بیان کرنے سے روکتے تھے؟ اگر خلیفہ دوم کے ان اقدامات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو فکری خطا کا احساس ہوجائے گا۔اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ دو جلیل القدر خلفاء رسول نے اس امت کو جس فتنے کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لیے ہر طرح کی تدبیر کی وہ بالآخر اس میں جا گری۔

''حقیقت'' کا نام نور اور فرقان یعنی قرآن مجید ہے جس سے امت کے سوادِ اعظم کا فکری اور عملی رشتہ علماء سو کی غلط رہنمائی کی وجہ سے تقریباً ٹوٹ چکا ہے اور اس انجام سے دوچار ہے جس کی خبر رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم بہت پہلے دے چکے ہیں۔ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ ضرور گزشتہ لوگوں کے نقش قدم پر چلوگے،بالشت بالشت اور ہاتھ ہاتھ،حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہوں تب بھی تم ان کی پیروی کروگے۔ہم نے (یعنی صحابہ نے) عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول،کیا اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ پھر اور کون''۔(بخاری و مسلم)

خلاصۂ بحث: گزشتہ صفحات میں جناب بدر احمد مجیبی صاحب کے مضمون کا جو تفصیلی جائزہ لیا گیا،اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱-قتل عمد میں اصل سزا تو قصاص ہے البتہ شاذ حالات میں دیت بھی لی جاسکتی ہے۔سورۂ بقرہ کی آیات ۱۷۸ اور ۱۷۹ اس باب میں حجت قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔جن اصحاب علم نے ولی مقتول کو قصاص اور دیت کے علاوہ معافی کا بھی اختیار دیا ہے ان کی بات اس لیے غلط

ہے کہ یہ نص صریح (آیات بقرہ) کے بالکل خلاف ہے۔اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین کی طرف جو اقوال منسوب کیے گئے ہیں وہ نا قابل اعتبار ہیں۔اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول صحیح ہے جس کا تعلق فتح مکہ کے موقع پر دیے گئے خطبے سے ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح لفظوں میں فرمایا ہے کہ قتل عمد میں ولی مقتول کو دو میں سے ایک چیز کا اختیار رہے، قصاص یا دیت (صحاح ستہ)۔معافی کا تعلق قتل عمد کے بجائے قتل خطا (سورۂ نساء:۹۲) اور جروح (زخموں) سے ہے (مائدہ:۴۵)۔

۲-قرآن مجید اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک واضح کلام ہے البتہ اس کے صحیح فہم کے لیے تدبر لازمی ہے (سورۂ ص:۲۹)۔اس کے علاوہ سیاق کلام اور نظائر قرآن کی طرف مراجعت ضروری ہے۔قرآن میں جہاں کہیں اجمال ہے اس کی وضاحت دوسرے مقام پر کردی گئی ہے (سورہ ہود:۱)۔دوسرے لفظوں میں قرآن خود اپنا شارح ہے۔احادیث یعنی اخبار آحاد میں چونکہ صدق و کذب دونوں کا امکان ہے اس لیے تفسیر قرآن میں ان کی طرف مراجعت میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے،صرف انہی حدیثوں سے اخذ و استفادہ کیا جائے جو روایت اور درایت کے معینہ اصولوں کے لحاظ سے صحیح ہوں اور ان سے نصوص قرآن کی تائید ہوتی ہے۔

۳-نصوص قرآن سے استخراج احکام میں علماء و فقہاء کے درمیان جو اختلاف ہوا،اس کی وجہ اختلاف فہم کے علاوہ وہ اہم بات ہے جس کا ذکر موسوی شریعت سے متعلق علمائے یہود کے اختلاف کے ذیل میں ہوا ہے یعنی 'بغی' ۔(دیکھیں سورۂ بقرہ:۲۱۳،سورۂ آل عمران:۱۹)۔ یہ 'بغی' کیا ہے؟'بغی' ان کے ہر عالم کی یہ ضد تھی کہ اس کا علم و فہم دوسرے عالموں سے زیادہ وسیع اور معتبر ہے اور یہ ضد کہ اس کی علمی و مذہبی سیادت کے آگے کسی اور مذہبی پیشوا کی پیشوائی کا چراغ جلنے نہ پائے۔

اللہ ہم سب مسلمانوں بالخصوص طبقۂ علماء کو 'بغی' کے فتنہ سے محفوظ رکھے۔(آمین)

حواشی (قسط اول:۱-۱۲)

(۱) دیکھیں احکام القرآن،ابن العربی مالکی،ج ۵،ص ۲۵۹۔(۲) تفسیر العیون والنکت،امام ابوالحسن علی ماوردی،ج ۳،ص ۲۴۰۔(۳) تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب)،امام رازی،ج ۲۰،ص ۳۳۵۔(۴) موضح فرقان

(شیخ الہندؒ)، سورہ بنی اسرائیل، آیت ۳۳، فائدہ نمبر ۱۱۔ (۵) تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، ج ۴، ص ۵۰۱۔ (۶) تفسیر جلالین، جلال الدین محلیؒ وجلال الدین سیوطیؒ، تفسیر سورۂ شوریٰ۔ (۷) فتح القدیر، علامہ شوکانیؒ، ج ۶، ص ۳۸۷۔ (۸) مقدمہ فی اصول التفسیر، امام ابن تیمیہؒ، ص ۹۳۔ (۹) الخیر الکثیر، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ص ۸۷۔ (۱۰) الموافقات فی اصول الشرعیۃ، امام شاطبیؒ، ج ۴، ص ۱۳۔ (۱۱) التکمیل فی اصول التاویل، علامہ حمید الدین فراہیؒ، ص ۱۵۔ (۱۲) کتاب الدیات، ابن ابی عاصم الشیبانی، ص ۱۰۳۔

حواشی (قسط دوم: ۱۳-۴۰)

(۱۳) الکافی، علامہ ابن عبدالبر مالکی، کتاب القصاص والدیات، ج ۲، ص ۱۰۹۹۔ (۱۴) الانصاف، مرداوی، ج ۱۰، ص ۵۔ (۱۵) موطا، امام مالکؒ، کتاب الزکوٰۃ، باب: ماتجب فیہ الزکوٰۃ۔ (۱۶) مسند احمد، امام احمد بن حنبلؒ، ج ۱، ص ۲۶۵ (اخرجہ البیہقی عن ابن عباسؓ)۔ (۱۷) مقدمہ عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایۃ، مولانا عبدالحئی حسنیؒ، ج ۱، ص ۱۳۔ (۱۸) صحیح مسلم (شرح نووی)، ج ۱، ص ۱۳، ۱۴۔ (۱۹) تفسیر طبری، ج ۱، ص ۲۱، تفسیر القرطبی، ج ۱، ص ۳۱۔ (۲۰) التفسیر والمفسرون، محمد حسین الذہبی، ص ۴۸۹۔ (۲۱) تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، ج ۱، ص ۶، ۷، مزید دیکھیں: تفسیر طبری، ج ۲۹، ص ۲۷۔ (۲۲) تفسیر طبری، محمد بن جریر طبریؒ، ج ۱، ص ۸۶۔ (۲۳) تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۔ (۲۴) تفسیر طبری، ج ۱، ص ۸۶۔ (۲۵) ایضاً۔ (۲۶) ایضاً۔ (۲۷) ترمذی، امام ترمذی (تفسیر سورۂ بنی اسرائیل)۔ (۲۸) تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ج ۱، ص ۹۸۔ (۲۹) مقدمہ فی اصول التفسیر، امام ابن تیمیہؒ، ص ۵۱۔ (۳۰) ایضاً، ص ۷۷۔ (۳۱) تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، ج ۱، ص ۳ (مقدمہ)۔ (۳۲) موطا، امام مالکؒ، کتاب القدر، باب: النہی عن القول بالقدر، حدیث نمبر ۳۔ (۳۳) المعجم الکبیر، طبرانی، حدیث نمبر ۲۶۷۸۔ (۳۴) ابوحنیفہؒ، حیاتہ وعصرہ، شیخ محمد ابوزہرہؒ، ص ۲۴۸۔ (۳۵) ایضاً، ص ۲۶۱۔۔ (۳۶) کشف بزدوی (کشف الاسرار)، فخر الاسلام علی بن محمد بزدویؒ، ج ۲، ص ۳۱۰۔ (۳۷) جامع بیان العلم، علامہ ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۱۱۹۔ (۳۸) تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی، ج ۱، ص ۳۔ (۳۹) جامع بیان العلم، علامہ ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۶۴۔ (۴۰) تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی، ج ۱، ص ۷۔

نوٹ: اس مضمون کے چند حوالے (حوالہ نمبر ۱، ۲، ۳، ۷، ۱۲، ۱۳، ۱۴) جناب بدر احمد مجیبی صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں، البتہ عربی عبارات کے ترجمے میں حذف واضافہ کیا گیا ہے۔ (الطاف)

علامہ شبلی نعمانیؒ

اوران کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت

پروفیسر اختر الواسع

"یہ مقالہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ہونے والے "علامہ شبلیؒ یادگاری خطبہ" کے لیے لکھا گیا جو ۲۳/فروری ۲۰۱۳ء کو دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی میں پیش کیا گیا"۔ (معارف)

آج کی یہ بزم اسلامی علم ودانش اور فکر وفہم کی تاریخ کے ایک ایسے عبقری اور نادرۂ روزگار بطل جلیل کے ذکر کے لیے وقف ہے جس کی یاد آنکھوں میں چراغوں کا ایک طویل سلسلہ اور دل و دماغ میں انوار کی ایک کہکشاں منور کردیتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی اول ڈیڑھ دہائیوں کے دوران فکر ونظر کی وہ تابندگی پیدا کی جس نے دورزوال کو دورعروج کی بلندیوں کے شانہ بہ شانہ اس سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت عطا کی اور عقل انسانی نے دیکھا کہ قوائے عقلی وفکری کے دور انحطاط میں بھی کوئی ذہن اس قدر توانا اور فعال وسرگرم ہوسکتا ہے جو اپنے تخیلات وافکار کو تمام قدیم وجدید علمی فتوحات کا جامع بنا لے۔

لیکن علامہ کے علمی کمالات اور آج کے خاص ومنتخب موضوع جو علامہ شبلی کے تعلیمی تصورات اوران کی عصری معنویت سے متعلق ہے پر کچھ عرض کرنے سے قبل میرا فرض ہے کہ شبلی اکیڈمی کے سربراہ اور اراکین ومتعلقین کے لیے اپنے جذبات ممنونیت کا اظہار کروں جنھوں نے مجھ کم علم و ہیچ فہم کو اس بارگراں کا متحمل ہونے کے لائق جانا۔ میرے نزدیک علامہ شبلی کے افکار وافعال کی یادوں

ڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

سے منور اس ادارے میں میری موجودگی ایک دریائے تند و تیز میں ایک تنکے کی طرح ہے جو علم و فضل کی روانی کے تصور سے ہی لرزہ براندام ہے۔ میری یہ کم مائیگی مجھ پر اس وقت اور بھی واضح و ظاہر ہوجاتی ہے جب میں محترم پروفیسر اشتیاق ظلی کی جانب دیکھتا ہوں جنھوں نے شبلی اکیڈمی جیسی ہماری نہایت بیش قیمت علمی میراث کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور ایک نئی حرکت و فعالیت دینے میں جو بیش بہا تعمیری کوششیں کی ہیں ہم ان کے احسان مند ہیں۔ پروفیسر ظلی صاحب کئی لحاظ سے اس ادارے کے سربراہ و منتظم ہونے کے منصب جلیلہ کے لیے موزوں ہیں۔ وہ ایک طرف تاریخ کے میدان میں اعلیٰ اختصاص کے حامل ہیں جو علامہ شبلی کی مرکزی و محوری توجہات کا بھی میدان تھا۔ دوسری طرف وہ اپنی مشرقی علمی میراث کے بحر ذخار کے بھی غواص اور اس خزانے کے زر و جواہر کے پارکھ ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب کی علمی روایت اور علوم جدیدہ بطور خاص سماجی علوم کی علمیات و طریق فکر پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اس علمی و فکری توانائی اور درک و فہم کے ساتھ پروفیسر ظلی صاحب نے شبلی اکیڈمی کی تجدید و حیات نو کا جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے توقع ہے کہ یہ ادارہ اپنے عظیم ستونوں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، شاہ معین الدین ندویؒ، مولانا ریاست علی ندویؒ، مولانا مسعود علی ندویؒ، سید صباح الدین عبدالرحمانؒ، مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ وغیرہم کی علمی و فکری روایت کو ایک نئی زندگی سے ہم کنار کر سکے گا۔

شبلی نعمانی برصغیر ہند میں مسلمانوں کی تہذیبی و علمی نشاۃ ثانیہ کے ایک ایسے نقش جمیل و جلیل ہیں جن سے صرف نظر کرکے ہندوستانی مسلمانوں کی گزشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کی جو بھی شکل پیش کی جائے گی وہ نہ صرف نامکمل اور بے بضاعت ہوگی بلکہ استناد و اعتبار سے بھی محروم ہوگی۔ ہماری تہذیبی تاریخ کی بہت سی اہم شخصیات تنوع اور کثرت ابعاد کی حامل رہی ہیں مگر ان میں شبلی کو یہ اختصاص اور انفرادیت حاصل ہے کہ ان کی علمی اور عملی دلچسپیوں اور اظہارات نے ایک ایسی نہایت روشن کہکشاں پیدا کی جس کا ہر ستارہ اپنے آپ میں آفتاب و ماہتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ انیسویں صدی تک ہندوستان کے ساتھ ساتھ ساری دنیا میں مسلمانوں کا جو علمی و تعلیمی نظام رائج تھا اس میں دینی و دنیوی علوم کی علاحدگی روا نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ انسان کی تمام تر ذہنی و علمی سرگرمیوں

کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص فلسفے کا ماہر ہوتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس میدان کے باہر کی باتوں سے بالکل بے خبر ہے۔ چنانچہ الکندی اور الفارابی جیسے فلسفی، فلسفے کے ساتھ ساتھ نجوم اور موسیقی میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور شعر و ادب پر علمی غور و خوض بھی ان کے دائرۂ سروکار کا حصہ تھا۔ ایسے افراد کی ایک طویل فہرست ہے جو بہ یک وقت دینی علوم کے ساتھ ساتھ تاریخ و جغرافیہ، ہندسہ و نجوم اور شعر و ادب تمام میدانوں میں یکساں مہارت کے حامل تھے۔ شبلی نعمانی اس عظیم علمی و تعلیمی روایت کے فیض یافتہ آخری عالم اور دانشور کہے جا سکتے ہیں۔

ہمہ جہت اور کثیر الابعاد ہونا ایک ایسا وصف ہے جسے انیسویں اور بیسویں صدی کی کئی علمی اور تہذیبی شخصیتوں کا نشان امتیاز کہا جا سکتا ہے مگر یہ وصف جس جس انداز سے شبلی کے ہاں ظاہر ہوا ہے اس کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ انہیں معروف طور پر مورخ اور سیرت نگار اور اس کے ساتھ ہی ایک ادبی نقاد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان میدانوں میں انہوں نے ایسے کارنامے انجام دیے جو اپنی مثال آپ ہو کر رہ گئے۔ 'الفاروق' اور 'المامون' اور ان سب سے بڑھ کر سیرت نبوی پر ان کی ضخیم تالیف ایک عالم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ فارسی شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر پر مبنی ان کی معرکۃ الآراء تالیف 'شعر العجم' اور اردو ادبی تنقید کے میدان میں 'موازنہ انیس و دبیر' کی انفرادیت اور کلیدی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ 'شعر العجم' نے تو خود اہل ایران کو حیران و ششدر کر دیا تھا اور یہ بات ان کے فہم سے بالاتر تھی کہ ایک ایسا شخص جس نے نہ کبھی ایران کی سرزمین پر قدم رکھا ہو اور نہ اسے فارسی زبان و ادب کا زندہ ماحول نصیب رہا ہو، اسے اہل زبان سے کوسوں دور رہ کر بھی اس زبان کے شعر و ادب کا ایسا گہرا ادرک کس طرح حاصل ہوا۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ علامہ شبلی کا ذہن اور اس کی جولانیاں بس اپنے ادبی کارناموں پر تمام ہو گئیں تو اسے سخت حیرت ہوتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ اس عبقری کا قلم حدیث و فقہ اور اسلامی قانون کے تہہ در تہہ معارف میں بھی اسی قدر ڈوبا ہوا ہے جتنا عبور اسے اسلامی فلسفہ اور علم کلام پر حاصل ہے۔ اسلامی علوم کے معاملے میں شبلی نعمانی دوسرے بہت سے لوگوں سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہیں کہ ان تمام علوم سے ان کی وابستگی بہ یک وقت اور انتہائی جزرسی تک پہنچی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس میں ایک خاص طرح کی اجتہادی شان بھی موجود تھی۔ ان خالص علمی امور میں مہارت تامہ حاصل ہونے کے ساتھ ہی شبلی نعمانی کے

عملی سماجی سروکار بھی اپنی ایک الگ شان اور حسن رکھتے ہیں۔ دینی تعلیم کو ایک نیا معنی و مفہوم اور رنگ و آہنگ دینے، اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور دینی اور دنیوی علوم کے درمیان خلیج کم کرنے کے لیے کی گئی ان کی جدوجہد جو ندوۃ العلماء کے ساتھ ان کی وابستگی کے زمانے میں ظاہر ہوئی ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جس سے ان کے دل و دماغ میں برپا افکار اور جذبوں کے طوفانوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ شبلی نعمانی نے خواتین کی تعلیم اور اس کے حوالے سے انہیں معاشرے کا ایک کارگر اور مفید حصہ بنانے سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس زمانے میں تو اپنے وقت سے بہت آگے کی بات تھے ہی آج بھی ان کی افادیت کم نہیں ہوئی ہے، کیوں کہ بہت سے مذہبی حلقوں میں آج بھی عورتوں کو محض گھر کی چہار دیواری کے اندر رکھنے اور چند معمولی دینی ضرورت کی معلومات فراہم کرنے تک محدود رکھنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

شبلی نعمانی طباعی، ذہانت اور ایجاد پسندی کی ایسی خداداد صلاحیتوں سے مالا مال تھے جنھیں ان کی حریت فکر نے مزید جلا دے دی تھی۔ تعقل اور تفکر کی قوتیں جو قدرت کی طرف سے ان پر ارزاں کی گئی تھیں انہیں اپنے وقت کے نامور علماء اور ماہرین سے اکتساب فیض کے ذریعے مزید جلا حاصل ہوتی اور دھیرے دھیرے شبلی میں چیزوں کو اپنے طور پر دیکھنے اور اپنی رائے قائم کرنے کا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ تعقل پسندی فطری طور پر شبلی کو سرسید کے زیر اثر لائی جو اپنی اجتہادی فکر و عمل اور اپنی بوقلموں شخصیت کے سبب اس زمانے کے جلیل القدر نمایندے اور اس کی شناخت بن چکے تھے۔ سرسید کے افکار کی کشش شبلی کو علی گڑھ لائی جہاں انہوں نے تقریباً سولہ برس ایک ایسے ماحول میں گزارے جو زبردست علمی تحقیق و تحریر کے ساتھ ساتھ شدید عملی سرگرمیوں سے عبارت رہا ہے۔ اس پورے عرصے میں شبلی نعمانی کی تمام ذہنی صلاحیتیں پوری کاملیت کے ساتھ بروئے کار نہ آتیں اگر انہیں سرسید کے افکار اور قربت سے وہ تحریک حاصل نہ ہوئی ہوتی جو علی گڑھ میں قیام کے دوران ان کے حصے میں آئی۔ اس تحریک نے شبلی کی خداداد قوتوں میں ایسی دھار پیدا کی جس کی زد میں خود سرسید کے بہت سے افکار اور سرگرمیاں بھی آگئیں مگر اس کے باوجود ان دونوں عبقریوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے احترام کا رشتہ بے داغ رہا۔

اپنے علمی ماضی کی تجدید کے سلسلے میں فکر و شعور کے سفر کے دوران علامہ شبلی نے فلسفے اور

دیگر علوم میں مسلمانوں کے بیش بہا کارناموں سے قربت حاصل کی اور اپنے مقالات کے ذریعے ایک دنیا کو ان سے واقف کرایا۔ اس ضمن میں فلسفے کے میدان میں مسلمانوں کے اکتسابات کو انہوں نے بطور خاص نشان زد کیا کیونکہ فلسفے سے علامہ کے ذہن کو ایک نسبت خاص تھی۔ انہوں نے فلسفے سے متعلق مسلمانوں کے ردوقبول کے رویے کو گہرائی سے سمجھا اوراس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کے ایک خاص علمی اکتساب یعنی علم کلام پر نہایت عرق ریزی سے غور کیا اوراس پر عبور حاصل کیا۔ اس طرح علم کلام سے متعلق ان کی وہ تحریریں سامنے آئیں جن میں آج بھی ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں کے علمی ماضی کی یاد تازہ کرنے کا مقصد مسلمانوں میں قومی فخر کے جذبات کو برانگیختہ کرنا نہیں تھا بلکہ ان میں اپنے آپ پر یہ اعتماد پیدا کرنا تھا کہ وہ ایک شاندار علمی ورثہ اور روایت کے حامل ہیں۔ شبلی نعمانی نے ماضی شناسی کا سبق دیا مگر ساتھ ہی ماضی پرستی کے رجحانات پر سخت نکتہ چینی بھی کی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان نئے زمانے کے تقاضے سے ہم آہنگ ہوں اور ایک ایسی اجتہادی نظر پیدا کریں جس کی روشنی میں اپنے علمی ورثہ کی تجدید اور نئے علوم کو حاصل کر کے ان میں اسلامی جہت پیدا کرنے کی کوششیں کی جاسکیں۔ یہ حقیقت ثابت اور قائم کر دینے کے بعد کہ مسلمانوں نے اپنی علم پروری کے ذریعہ انسانی تہذیب کے ارتقاء میں بیش بہا خدمات انجام دیں جو کسی بھی دوسری قوم سے نہ صرف کم تر نہیں بلکہ بعض اعتبارات سے فزوں تر ہیں، فطری تھا کہ علامہ شبلی اس ماضی کے آئینے میں اپنے حال کو دیکھتے اور موجودہ صورت حال کو درست کرنے پر مائل ہوتے۔ شبلی کا زمانہ قدیم وجدید کی شدید کشمکش کا زمانہ تھا اوراس وقت کے اہل نظر سرسید کی تحریک اور رہنمائی کے تحت یہ محسوس کررہے تھے کہ مسلمان اپنے تقلیدی رویے کے سبب علم کے میدان میں پچھڑ رہے ہیں۔ اس صورت کو انگیز کرنے اوراس میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر نظر ثانی کی جائے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ شبلی جس شدت سے علمی تحقیق پر متوجہ تھے اسی شدت سے ان کا ذہن تعلیم کی اصلاح پر بھی مرتکز تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو قدیم وجدید خیمہ بندی سے باہر نکلنے کی تلقین کی۔ وہ کہتے ہیں:

''آج کل مسلمانوں میں دوگروہ جدا جدا ہوگئے ہیں۔ قدیم تعلیم یافتہ یہ

خیال کر کے کہ دین میں مشغول ہونے سے وہ دنیا کو کسی طرح حاصل نہیں کر سکتے محض دین میں منہمک ہو گئے ہیں۔ اور جدید تعلیم یافتہ یہ خیال کر کے کہ وہ دنیا کے درپے ہو کر دین میں کمال حاصل نہیں کر سکتے، محض دنیوی تعلیم میں سرگرم پائے جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ دونوں گروہ غلط فہمی پر ہیں اور اس صراط مستقیم پر ان میں سے کوئی گروہ قائم نہیں ہے جس کی ہدایت اسلام نے کی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ خیال کرتے ہیں کہ جب تک مسلمان یورپ کے علوم جدیدہ سیکھ کر ان میں کمال حاصل نہ کریں گے، مسلمانوں کی قوم ترقی نہیں کرے گی۔ قدیم تعلیم یافتہ خیال کرتے ہیں کہ یورپ کا سائنس اور فلسفہ حاصل کرنے سے مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں خلل آ جائے گا اور اگر مسلمان مسلمان نہ رہے تو ان کی دنیوی ترقی میں مسلمانوں کی قومی ترقی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ یہ خیالات ہیں جن کے سبب دونوں گروہ متحد نہیں ہو سکتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کرنا نہیں چاہتے''۔ (۱)

تعلیم کے موضوع پر شبلی کی پہلی مختصر تصنیف ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کے عنوان سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ (۲) یہ اگر چہ ایک مضمون تھا جو ایجوکیشنل کانفرنس کی دعوت پر لکھا گیا تھا، اور اس کے اجلاس منعقدہ ۲۷ ر دسمبر ۱۸۸۷ء قیصر باغ لکھنؤ میں پڑھ کر سنایا گیا مگر سید سلیمان ندوی کے بقول ''یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا''۔ (۳) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا علمی وفکری خمیر جن بنیادوں پر تیار ہوا تھا، ان میں تعلیم کے موضوع سے مولانا کی گہری دلچسپی شامل تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تاحیات اس موضوع پر سوچتے، لکھتے اور بولتے رہے۔ ان کی دینی، ملی اور اجتماعی فکر کے تعلق سے یہ فکر سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

اس فکر کا محور ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح اور اس کی تشکیل نو تھا۔ وہ ہمہ تن اس کے لیے کوشاں اور ہمہ دم اس کے لیے بے تاب و مضطرب رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی کی نظر میں زوال آمادہ ملت اسلامیہ کو عروج و ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے کے لیے اس کے اندر تعلیم کا فروغ لازمی تھا۔ جس میں بحیثیت مجموعی مسلم قوم بہت پیچھے تھی۔ جب کہ دنیا کی دوسری

قومیں بہت آگے بڑھ چکی تھیں۔دوسری طرف شبلی کی نظر میں بدقسمتی سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالم اسلام کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی تعلیم کا ڈھانچہ بگڑ چکا تھا۔اس کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔جب تک تعلیمی نظام اپنی صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہو جائے،اس وقت تک مسلمانوں کی اجتماعی ترقی اور فلاح و بہبود کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔مولانا تاریخ اسلامی کے شناور تھے۔مسلمانوں کے عہد زریں کی قابل رشک تاریخ ان کی نگاہوں میں کھلی کتاب کی طرح تھی جس کا ایک ایک ورق دوسری قوموں کے مقابلے میں علمی برتری کی داستانِ عظمت سے مزین تھا۔اس لیے وہ تعلیم کے تعلق سے مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی بے اعتنائی پر شدید رنج وغم کا اظہار کرتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں شبلی نے ترکی اور مصر و شام کا سفر کیا تھا جس کی روداد انہوں نے ''سفر نامہ روم و مصر و شام'' کے عنوان سے تحریر کی۔اس میں وہ نہایت قلق و اضطراب کے ساتھ لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلام میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابتر اور ذلیل ہو گیا ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی جس کا یہ نتیجہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے۔ اور جس قدر کہیں کہیں کچھ اور بچا ہے،آیندہ اس کی بھی امید نہیں''۔(۴)

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ: شبلی کی علمی کوششوں کا ایک اہم میدان اور عنوان ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا فروغ اور اسے ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا تھا کہ جو ایک طرف دور غلامی میں ان کے لیے آزادی و ترقی کی راہ کو کھول سکے،دوسری طرف وہ مذہب سے ان کے رشتے کو مستحکم کرنے میں معاون ہو۔چنانچہ شبلی نے مختلف پلیٹ فارموں سے اس کے لیے کوششیں کیں۔انہیں جہاں بھی اس غرض سے بلایا گیا وہاں گئے اور جس طرح کا بھی ان سے تعاون طلب کیا،وہ انہوں نے دیا۔چنانچہ سرسید کی خواہش پر انہوں نے علی گڑھ سے رشتہ قائم کیا اور وہاں تدریس کے فرائض انجام دیے۔وہاں ان کے قیام سے اس کی فضا پر نہایت گہرے اثرات قائم ہوئے۔شبلی نے جس وقت علی گڑھ میں قدم رکھا،اس وقت علی گڑھ کی فضا پر مغرب پسندی اور مغربی تہذیب و ثقافت کی اندھی نقالی کی دھند چھائی ہوئی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ اس دھند کو کم کرنے اور طلبہ کو تعلیم کے اصل اور فطری مقاصد سے باخبر و ہم آہنگ کرنے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔

خود شبلی کو بھی اس کا احساس تھا۔ مولوی حکیم محمد عمر کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے۔ اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا''۔ (۵)

حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ کو ایک مسلم یونیورسٹی کی شکل دینے میں شبلی نے اہم کردار ادا کیا۔ یونیورسٹی کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے میں ہز ہائی نس سر آغا خاں سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ انہوں نے ہی اپنی کوششوں سے یونیورسٹی کے لیے اکتیس لاکھ کی خطیر رقم جمع کی تھی۔ شبلی نعمانی نے ان کی کوششوں کو جس طرح سراہا وہ ان کے اس جملے سے ظاہر ہے: ''حکومت انگریزی کی ابتدائی تاریخ سے آج تک مسلمانوں نے کبھی ایسی بلند ہمتی کا اظہار نہیں کیا جو آج ایک یگانۂ قوم ہز ہائی نس سر آغا خاں کی ذات سے وجود میں آئی''(۶)۔ لکھنؤ میں جب مسلم یونیورسٹی کا وفد آیا تو نہایت خوشی کے ساتھ اس کی کوششوں میں شرکت کی۔ الندوہ میں اس تعلق سے مضمون لکھا اور اس کی زبردست حوصلہ افزائی کی۔ لاہور میں جب اس کا وفد گیا تو خود مولانا شبلی بھی اس کے رکن تھے۔ چنانچہ وہیں اپنی وہ مشہور فارسی نظم پڑھی جس کا مطلع اور چند اشعار یہ ہیں:

همیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد ۔۔۔ کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد
علوم تازہ را باشرع و حکمت باہم آمیزیم ۔۔۔ الٰہی با ریاضی و طبیعی آشنا باشد
بساط تازہ چینیم و طرح نو در اندازیم ۔۔۔ کہ در بزم نوے پیشینیاں را نیز جا باشد
ولے پیدا نہ شد ایں خواب را چوں صبح تعبیرے ۔۔۔ گماں بردیم ملک اندیشہ از روئے خطا باشد
بکیش شیعہ و سنی سر آغا خاں خدا نبود ۔۔۔ و لیکن کشتی اسلامیان را ناخدا باشد (۷)

(یونیورسٹی کے قیام سے ہمارا صرف یہی ایک مقصد ہے کہ ہماری تعلیم کا نظام و سلسلہ ہمارے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ جدید علوم کو ہم شرع اور حکمت سے باہم کر دیں۔ اور اسلامی فلسفہ کی ریاضی اور سائنس سے آشنا ہو۔ ہم نئی بساط چنیں اور جدید نقشہ تیار کریں۔ اور اس نئے سانچے میں اسلاف کی بھی جگہ ہو۔ لیکن یہ خواب صبح کی تعبیر کی طرح ظاہر نہیں ہو پایا۔ ہم اپنے قومی مفاد کا خیال رکھیں اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ شیعہ و سنی کے نزدیک سر آغا خاں خدا تو نہیں ہیں۔ لیکن وہ مسلمانوں کی کشتی کا ناخدا ضرور ہیں)

اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے نصاب کی تشکیل نو میں شبلی نے ہی بنیادی کردار ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شبلی ہی ہیں جنھوں نے حیدرآباد میں ایک آزاد اور مستقل یونیورسٹی کا تمہیدی خاکہ پیش کیا (۸)۔ نیز بھوپال کے عربی مدارس، مشرقی بنگال اور آسام کے مدارس کی اصلاح، شملہ میں مشرقی علوم وفنون کی ترقی و اصلاح اور ان کا فروغ اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے نصاب کی تشکیل میں شبلی نے اپنی ذاتی دلچسپیوں سے اہم کردار ادا کیا۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ اپنے تعلیمی افکار کی عملی تعبیر کا اصل مرکز وہ ندوۃ العلماء کو تصور کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء سے ان کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ ندوہ کو ایک ایسے ادارے کی شکل میں دیکھتے تھے جو مسلمانوں کی تعلیم کی زریں تاریخ کا نمایندہ ہو۔ وہ اسے ایک مدرسہ کے بجائے ایک بڑے دارالعلوم اور جامعہ اسلامیہ کی شکل میں دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ ندوہ اور اصلاح نصاب کے تعلق سے ان کے مضامین اور خطبات سے ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ندوہ کے تعلق سے ان کے وسیع خواب کی تعبیر ممکن نہ ہوسکی۔

شبلی کا تعلیمی نظریہ اور عہد حاضر میں اس کی معنویت: تعلیم کے تعلق سے شبلی کا نقطۂ نظر نہایت وسیع النظری پر مبنی تھا۔ وہ ایک ایسے تعلیمی نصاب و نظام پر زور دیتے تھے جو ایک طرف موجودہ عہد کے تمدنی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھنے والا ہو تو دوسری طرف اس میں مذہب کو فکری اور عملی سطح پر اساسی حیثیت حاصل ہو۔ وہ مذہب کے اصولی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی بھی نوع اور کسی بھی سطح کی تعلیم کو اسلامی سماج اور انسانیت کے لیے مفید تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ جدید وقدیم اور مذہبی وتمدنی تعلیم کے متناسب امتزاج پر زور دیتے تھے۔ اس طرح ان کی نظر میں نہ تو یورپ کا تعلیمی منظر نامہ قابل رشک تھا، جس کی تقلید کی جاسکے اور نہ ہی مسلم دنیا کا فرسودہ و پیش پا افتادہ نظام تعلیم اس قابل تھا کہ اسے باقی رکھنے پر اصرار کیا جائے۔ سرسید کے ساتھ شبلی کے اختلافی نقطۂ نظر کی بنیاد یہی تھی کہ ان کی نظر میں سرسید کے مدرسۃ العلوم میں مذہب کو اساسی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ شبلی آخری حد تک مشرقی علوم کے حامی و موید تھے۔ ان کی نظر میں اس کی اصلاح اور تشکیل نو کی ضرورت تھی نہ کہ سرے سے اس سے دست بردار اور دامن کش ہوجانے کی۔ تعلیم کا بنیادی خاکہ ان کی نگاہ میں مشرقی تعلیم پر ہی

مشتمل تھا۔محض مغربی تعلیم کی بنیاد پر حاصل ہونے والی ترقی کو وہ مسلمانوں کی ترقی تصور نہیں کرتے تھے۔مقالات شبلی حصہ سوم میں ان کے ''مشرقی کانفرنس'' اور ''احیائے علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل'' جیسے مضامین سے ان کے اس نقطۂ نظر پر واضح روشنی پڑتی ہے۔سفر نامہ روم ومصر وشام میں لکھتے ہیں:

''میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے، وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے، لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی''۔(۹)

سرسید سے متعلق اس شکوے کا انھوں نے متعدد مواقع پر اظہار کیا ہے کہ وہ مشرقی تعلیم کو قومی فلاح و بہبود کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔جب پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی تعلیم کی شاخ کا قیام عمل میں آیا تو سرسید نے اس کی مخالفت میں پے بہ پے تین مضامین تحریر کیے۔شبلی کے الفاظ میں ''پنجاب یونیورسٹی پر ان کے تین پرزور آرٹیکل قلعہ شکن توپیں تھیں، جن کے صدمے نے مشرقی تعلیم کو چکنا چور کر دیا''۔(۱۰)

شبلی کے تعلیمی نقطہ نظر میں تربیت کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔وہ محض تعلیم کے حصول کو کافی تصور نہیں کرتے تھے۔افراد سازی ان کے مزاج کا حصہ تھی جس کو وہ تعلیمی نظام اور منصوبہ بندی کا ایک اہم مقصد اور حصہ تصور کرتے تھے۔ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اپنے تعلیمی منصوبوں کو شرمندہ تکمیل نہ ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ بار بار اس کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ انہیں دائرہ عمل کو تبدیل کر کے دوسرے ادارے پر محنت کرنی چاہیے اور اس کو گروکل کے طرز پر چلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔اس وقت گروکل کی تعلیم سادگی وقناعت اور جہد و جفاکشی کا مثالی نمونہ تھی، تربیت کے لحاظ سے وہ گروکل کے نظام کو قابل تقلید سمجھتے تھے۔اپریل ۱۹۱۰ء میں مولانا

حمیدالدین فراہیؒ کو لکھتے ہیں:

''کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو۔ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم ونسق درست کرایا جائے۔ اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو''۔ (۱۱)

جدید تعلیم سے متعلق شبلی کا نقطۂ نظر: شبلی مذہبی یا مشرقی تعلیم کے حامی ومؤید بلکہ اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ضرور تھے، تاہم جدید یا عصری تعلیم کی ضرورت کے وہ نہ صرف قائل تھے بلکہ موجودہ عہد میں مذہبی وتمدنی تقاضوں کی تکمیل کے لیے بھی اس کو ناگزیر خیال کرتے تھے۔ انھوں نے نظریاتی سطح پر ہی نہیں تھا بلکہ مختلف عملی سطحوں پر اس کی کوشش وکاوش بھی کی۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں انھوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ اپنی مختلف تحریروں اور تقریروں میں انھوں نے مسلمانوں کی توجہ حلقۂ علم ودانش کے اس پہلو کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی کہ قدیم نافع کے ساتھ جدید صالح کے حصول کے بغیر کوئی قوم ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی۔ (۱۲)

شبلی علماء کے اس گروہ کے ناقد تھے جس کی نظر میں علوم جدیدہ کے حصول کی زد مذہبی عقائد پر پڑتی تھی۔ ان کی نظر میں علماء کے لیے ان کے حصول کا فائدہ یہ تھا کہ غزالی کی طرح ان علوم کو حاصل کرنے سے ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہوسکتا ہے۔ ایک جگہ تو انھوں نے کھل کر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ: ''علماء کو علوم عربیہ کے ساتھ علوم غربیہ بھی حاصل کرنا چاہئیں''۔ (۱۳)

دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح فکر شبلی کے آئینے میں: شبلی کے تعلیمی افکار ونظریات کا ایک اہم پہلو دینی مدارس کی تعلیم وتربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں بعض مقامات پر اس کی طرف ضمنی اشارے کیے جا چکے ہیں، تاہم ان سطور پر الگ سے نگاہ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شبلی نعمانی زندگی بھر اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس کی تجدید نو کی جائے۔ ان کے نصاب ونظام کو از سر نو مرتب کیا جائے تا کہ مدارس سے ایسی نسل نکل سکے جو موجودہ دور میں اسلام کی دعوت واشاعت کی خدمات انجام دے سکے اور اسلامی

عقائد ونظریات پر ہونے والے اعتراضات کے تعلق سے وہ اسلام کے دفاع پر کمر بستہ ہو سکے۔ ان کے خیال میں جدید وقدیم علوم کے حاملین کے جو دو گروہ مسلم معاشرے میں پیدا ہو گئے تھے اور ان میں کشمکش کی جو صورت حال قائم تھی وہ کسی بھی طرح امت کے حق میں نہیں تھی۔ ندوۃ العلماء کی تاسیس کے اغراض میں ان کی نظر میں یہ بات شامل تھی کہ اس کی تعلیم سے ''ایسے روشن خیال علماء پیدا ہوں جو دونوں قسم کے علوم کے جامع ہوں اور وہ جدید اور قدیم گروہوں کے درمیان رابطہ و اتحاد کا کام دیں اور اسلام کا وہ مکمل نقشہ ان کے پیش نظر ہو جس میں دین اور دنیا دونوں جمع کیے گئے ہوں۔(۱۴)

علامہ شبلی کی نظر میں درس نظامی کے نصاب کی اپنی بہت سی خوبیاں تھیں، ان خوبیوں کا انھوں نے اعتراف کیا ہے(۱۵)۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی وہ اس میں وسیع تبدیلیوں کو وقت کا نہایت اہم تقاضا تصور کرتے تھے۔ ان کے نظریے کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی تنزل کا اصل سبب ہی ''نصاب تعلیم کا نقص'' تھا(۱۶) اس لیے وہ علوم عالیہ اور علوم آلیہ دونوں میں اصلاح کو ایک جامع نصاب تعلیم کی تشکیل کے لیے ضروری امر تصور کرتے تھے۔ ندوہ کے مختلف اجلاسوں میں انھوں نے بار بار اس کی آواز بھی اٹھائی اور اس کے پلیٹ فارم سے انہوں نے اس کی کوششیں بھی کیں۔ اگر چہ شبلی کو اصلاح نصاب کے تعلق سے اپنے خاکے میں رنگ بھرنے کا پوری طرح موقع نہیں مل سکا تاہم اس تعلق سے ان کی فکری و علمی کوششوں سے ہندوستان کی دینی تعلیم کی فضا پر مثبت اور گہرے اثرات ونقوش مرتب ہوئے۔

اخیر میں خلاصۂ کلام کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شبلی کی تعلیمی فکر انتہائی متوازن اور جامعیت کی حامل تھی۔ ان کے معاصرین میں اس توازن و جامعیت کی جھلک کم نظر آتی ہے اور یہی شبلی کا سب سے اہم امتیاز ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق شبلی کی تعلیمی فکر آج بھی اتنی ہی معنویت کی حامل ہے جتنی کہ وہ کل تھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی تقاضے پر ان کا یہ تبصرہ آج بھی اتنا ہی پُر مغز اور قابل عمل ہے جتنا کہ وہ کل تھا کہ: ''ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی۔ ہمارے دور کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور

دوسرا مغربی ہے''۔(۱۷)

علامہ شبلی کا یہ تصور علم اور ان کی یہ تعلیمی بصیرتیں محض قصہ پارینہ نہیں ہیں۔اگر چہ ہم نے اپنے علم و دانش کے نہ جانے کتنے گہر ہائے گراں مایہ کو طاق نسیاں پر ڈال دیا ہے مگر شبلی کے تعلیمی افکار اس قدر توانا ہیں اور ان کی توانائی میں اس قدر فوری لازمیت موجود ہے کہ ہم اپنے تمام تر شیوۂ فراموشی کے باوجود ان سے دامن کش نہیں ہوسکتے۔علامہ کے تعلیمی افکار اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے ان کی عملی جدوجہد آج بھی ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے آس پاس روشنی کے ایک ہالے کی طرح موجود ہے، خاص طور پر اس پس منظر میں کہ جدید و قدیم کی کشاکش جو ان کے زمانے میں مسلم ذہن و فکر کو درپیش تھی آج بھی ایک اور عنوان سے اور نئی شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہورہی ہے۔

اس کشاکش سے نبرد آزما ہونے اور اس سے ایک متوازن راہ نجات حاصل کرنے کے لیے علامہ شبلی ہمارے سب سے بڑے رہنما ہوسکتے ہیں کہ وہ نہ تو ماضی پرست تھے نہ مشرق کے بے جا مقلد اور نہ مغرب سے مرعوب محض۔علامہ نے ہمیں ماضی کے فرسودہ عناصر کو مسترد کر کے اس کی زندہ توانائی کو عصری ذہن و فکر کی بامعنی اور مثبت روشنیوں سے آمیز کر کے ایک نئی اسلامی دانش کو ترکیب دینے کا جو گر سکھایا تھا، آج اسے آج علم و آگہی کے بند خزانوں کی کلید بنایا جاسکتا ہے۔مسلم دانش کے لیے اس چیلنج کا سامنا اور اس سے سرخ رو گذرے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

حوالہ جات

(۱) خطبات شبلی (طبع سوم): مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۸۔۹۸۔ (۲) حیات شبلی: مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۹۔ (۳) ایضاً۔ (۴) سفرنامہ روم و مصر و شام، شبلی نعمانی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص ۸۴۔ (۵) مکاتیب شبلی (حصہ اول)، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۷۔ (۶) حیات شبلی، حوالہ بالا، ص ۴۱۵۔ (۷) ایضاً، ص ۴۱۵۔۴۱۶۔ (۸) ایضاً، ص ۴۰۔ (۹) سفرنامہ روم و مصر و شام، حوالہ بالا، ص ۱۶۰۔ (۱۰) مقالات شبلی (جلد سوم)، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، (طبع دوم) ۱۹۵۵ء، ص ۱۴۶۔ (۱۱) مکاتیب شبلی، (جلد دوم)، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۷ء، ص ۳۹۔ (۱۲) مکاتیب شبلی، حوالہ بالا، ص ۵۴۔۵۵۔ (۱۳) خطبات شبلی، حوالہ بالا، ص ۹۰۔ (۱۴) ایضاً، ص ۹۱۔ (۱۵) مقالات شبلی، حوالہ بالا، ص ۱۲۴۔ (۱۶) ایضاً، ص ۱۲۸۔ (۱۷) ایضاً، ص ۱۵۷۔

فن تاریخ گوئی میں علمائے باقیات کا حصہ

ڈاکٹر راہیؔ فدائی

تاریخ گوئی کا فن دراصل سمندر کو قطرہ قطرہ کوزے میں سمونے کا فن ہے۔ یہ باوقار و ذی اعتبار فن ایک ایسے مسافر کی طرح ہے جو حال کی پر پیچ و طلسماتی راہوں سے گزر کر ماضی کی منزل مقصود کی طرف گامزن ہے، تاریخ گوئی کا یہ ہنر انتہائی مشکل ہونے کے باوجود بہت ہی مفید اس لیے ہے کہ اس کے توسط سے موجودہ واقعات و حالات کا تحفظ، گزرے ہوئے کل کے سانحات وساعات کا تعین اور مستقبل کے حادثاتی لمحات کا تشکل ممکن ہوتا ہے جس سے تاریخ و تحقیق کے باذوق طالب کے لیے صحیح و مدلل معلومات کی فراہمی سہل ہوجاتی ہے۔ تاریخ گوئی کی تعریف اور تفصیل بیان کرتے ہوئے عصر حاضر کے ماہر فن حضرت علامہ اشرف سعودی باقوی رقم طراز ہیں:

> ''تاریخ ایسے مناسب لفظ یا الفاظ میں کسی واقعے کو بیان کرنے کا نام ہے جن کے اعداد حروف سے سن مطلوبہ حاصل ہو، یہ بیان نظم و نثر دونوں میں ہوتا ہے، نظم میں اکثر جزوِ مصرع یا کامل مصرع حصول مقصد کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی تکمیل مقصد کے لیے اس سے زیادہ کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاریخ بہت مشکل، دقیق، مختلف الاقسام اور طویل الذیل فن ہے''۔ (ماخوذ از: نفیر ویلور ۱۴۱۳ھ، ص ۲۱، مضمون ''تاریخی قطعے'')

بعض اہل قلم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس فن کے موجد عرب العرباء ہیں، حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ قرین قیاس نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ اس فن لطیف میں حروف ابجد سے اعداد کا حساب لگایا جاتا ہے جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا

نمبر ۲۱۔ تیسرا کراس، عثمان اسٹریٹ، خوش حال نگر، کے جی ہلی، بنگلور ۴۵۔

نـــحســـب'' (بخاری) یعنی ہم ایک ان پڑھ قوم ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب کرنا۔ اس حدیث شریف کی موجودگی میں ''مشکوٰۃ التاریخ'' کے مصنف جناب خداداد خان مونس جے پوری کا ادعا کہ ''تاریخ گوئی ایک عجیب فن ہے جس کے موجد عرب کے وہ زبان دان ہیں جن کی بدولت عربی زبان کو ''ام اللسان (؟) تسلیم کیا جاتا ہے۔ (ص ۷ مطبوعہ ۲۰۱۲ء/ راجستھان اردو اکادمی، جے پور) قابل قبول نہیں ہوگا۔ یہاں سیرت طیبہ کے اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مدینۂ منورہ میں تعلیم یافتہ یہود کا ایک گروہ حضور اکرمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، آپؐ نے انہیں ایمان کی ترغیب دینے کی خاطر سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔ ان یہودیوں نے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیت کریمہ ''الـــمّ'' سن کر اس کے عدد اکھتر (۷۱) کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا ''**کیف نـدخل فی دین مد تہ احدی و سبعون سنۃ**'' یعنی ہم اس دین کی پیروی کیسے کریں جس کی عمر صرف اکھتر سال ہے۔ آپؐ نے ان لوگوں کی کج فہمی کو ملاحظہ فرمانے کے بعد مسکراتے ہوئے دیگر حروف مقطعات الـمّـصٓ ، کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ کی تلاوت فرمائی تو وہ یہود مبہوت و پریشان ہوگئے۔ (بیضاوی شریف)۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ یہودی علما تاریخ گوئی کے فن سے واقف ہی نہ تھے بلکہ اپنی دانست میں اس سے نتائج کا بھی استنباط کرتے تھے۔ غرض کہ یہ فن زمانۂ جاہلیت میں یہودیوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے عربوں میں منتقل ہوا اور پھر اسلام کے ورود مسعود کے بعد مسلمانوں کے تعلیمی اشتغال اور فنی انہماک کے سبب دیگر فنون کی طرح اسے بھی خوب نشوونما پانے اور ترقی و ترویج کے مراحل طے کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ بعدازاں اس وقیع علم کو ایرانیوں نے گلے لگالیا۔ چنانچہ اہل فارس نے تاریخ گوئی میں نئے نئے تجربے کیے اور اس فن کو بام عروج تک پہنچادیا۔ اس کے بعد لسانیات کے اخذ وقبول کے اصول کے تحت اردو زبان نے اس فن کی خوبیوں کے مدنظر فارسی ادبیات سے لے کر اپنے دامن میں بھرتے ہوئے اسے اپنی نازک خیالی اور بلند فکری کے گل بوٹوں سے آراستہ کردیا۔ چنانچہ اردو شعراء وادبا نے اس فن شریف میں اپنی طباعی وخلاقی کا مظاہرہ اس طور پر کیا کہ اردو کا خزانۂ ادب تاریخ گوئی کے عمدہ وتابندہ لعل وگہر سے بہرہ ور ہوگیا، اس طرح ہر عہد میں اس معدن زر و جواہر میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ علم جفر کے اس گنجینۂ علم وادب کا ایک معتدبہ حصہ اور تاریخ گوئی کے اس سلسلۂ زریں کا

بیش بہا حلقہ علمائے جامعہ باقیات صالحات، ویلور (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کی ادبی خدمات کی صورت میں تاریخ کے گمشدہ اوراق پارینہ میں پوشیدہ تھا جسے راقم الحروف مختلف مصادر و مآخذ سے تلاش کر کے اہل علم کے ذوق طبع کی تسکین کے لیے پیش کر رہا ہے تاکہ باقیات کی علمی و ادبی تاریخ کا یہ روشن پہلو محققین کی توجہ خاص کا مرکز اور مؤرخین کے زور قلم و دائرہ کار کا محور بنا رہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ بے شمار علمائے باقیات میں سے ہمارے پیش نظر وہی منتخب فضلا ہیں جن کے کارنامے کسی نہ کسی طور تاریخ کا حصہ بن سکے ہیں اور جنہیں شعر و ادب سے تعلق خاطر رہا ہے، ہم انہیں میں سے اہم ترین شخصیتوں کا اجمالی تذکرہ و تعارف نذر قارئین کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ فخر ویلوریؒ: حضرت علامہ حافظ قاری الحاج شاہ عبدالقادر بادشاہ فخر ویلوری (ولادت ۱۲۷۰ھ۔ وفات ۱۳۳۳ھ) کے جد اعلیٰ ملک یمن سے وارد ہند ہوئے تھے۔ ان کے والد ماجد قاری یوسف علی بادشاہ یمنی فرزند مولانا حافظ قاری ابراہیم علی بادشاہ یمنی کا شمار ملک کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ حضرت فخر حضرت وہاب العلوم بانی مدرسۂ باقیات صالحات کے خالہ زاد بھائی ہونے کے علاوہ تلمیذ ارشد اور خلیفۂ خاص بھی تھے۔ ان کو انشا و تحریر اور وعظ و تذکیر میں یکساں مہارت حاصل تھی، وہ فصیح و بلیغ اور شیریں بیاں مقرر تھے اور عوام و خاص میں سلطان الواعظین کے لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ جیسا کہ حضرت علامہ علّمی باقوی (متوفی ۱۹۴۶ء) نے فرمایا

عالمِ ایزد پرست وواعظِ شیریں زباں در بلاغت آنکہ بودہ غیرتِ سحباں چہ شد

(مرثیۂ ترکیب بند، مطبوعہ ۱۳۳۴ھ مدراس)

انہوں نے حضرت بانی علیہ الرحمہ کے خلف صالح حضرت علامہ قاری ضیاء الدین محمد عبدالقادر (ولادت ۱۲۸۱ھ وفات ۱۳۶۰ھ) کے ہمراہ مدرسۂ صولیتہ، مکہ مکرمہ میں حضرت پایۂ خرمنِ علامہ رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۰۸ھ) کی سرپرستی میں علوم متداولہ میں تخصص حاصل کیا اور تفسیر و حدیث کے علاوہ فقہ و اصول میں کمال درجے کی استعداد بہم پہنچائی۔ اور اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں مسائل خطر و اباحت پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بنام ''الباقیات الصالحات''

تصنیف کی جو ۱۳۲۲ھ میں احسن المطابع ، مدراس سے شائع ہوکر بہت مقبول ہوئی تھی۔ دیگر تصنیفات میں ''محاسن الاعمال'' اور ''المقاصد'' کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت فخر شعر وسخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، خصوصاً تاریخ گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے متعدد واقعات ومختلف تقریبات کے مواقع پر تاریخی قطعے بڑی ہنرمندی سے کہے۔ جن میں مدرسۂ باقیات کی عمارت کے مکمل ہونے پر کہا گیا قطعہ بالخصوص دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔ اس تاریخ میں بیک وقت صنعت تخریج اور صنعت منقوطہ دونوں کا استعمال انتہائی چابک دستی سے کیا گیا ہے، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

صدائے حبذا یا للفرح از شش جہات آمد وجودش بالیقیں سرچشمۂ آبِ حیات آمد

سر حاسد فدا شد چوپئے منقوطہ تارنخش ندا از غیب ''تلک الباقیات الصالحات'' آمد

۸ (تیرہ سو چار) ۱۳۰۴ھ: ۸۔۱۳۱۲

علاوہ ازیں انہوں نے اپنے برادرِ خورد مشہور شاعر مولانا عبدالقدوس ضوؔ ویلوری (متوفی ۱۳۶۵ھ) کے ضخیم دیوان کی طباعت پر بہترین وموزوں قطعۂ تاریخ کہا تھا جس میں ایک لطیف اشارے سے تخرجہ کے عمل کو بروئے کار لاتے ہوئے مطلوبہ سن کا استخراج کیا ہے۔

ہوگیا طبع جو دیوانِ ضوؔ ہوا سرسبز گلستانِ سخن

فخر سے سرکو اٹھاکے ہاتف سال بولا ''چمنستانِ سخن''

۵ (تیرہ سو نو) ۱۳۰۹ھ: ۵۔۱۳۱۴

حضرت فخر کی قادر الکلامی کا ایک اور ثبوت مدرسہ باقیات کی مسجد کے محراب پر نصب شدہ سنگین کتبہ کا وہ تاریخی قطعہ ہے، جس میں انہوں نے بنائے مسجد کی تاریخ محل وقوع سے کامل مناسبت رکھنے والی آیت کریمہ سے الفِ جمع کو حذف کرتے ہوئے استنباط کی ہے۔

للّٰہ الحمد خوشا مسجدِ فرّخ منظر کہ ندید است گہے چشم فلک تمثالش

حبذا در دلم از عالم قدس القا شد ''اذکرو اللہ قیاماً و قعوداً'' سالش

(تیرہ سو بتیس) ۱۳۳۲ھ

فن تاریخ گوئی میں ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہوئے فخر الشعراء حضرت علیؔ نے

درج ذیل شعر کہا تھا:

شیخ در تاریخ گوئی گوئے سبقت بردہ است یاسمینِ باقیات از مرگِ او پژمردہ است
("ترکیب بند")

مذکورہ شواہد کی روشنی میں ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی تاریخیں ان شاء اللہ تا قیامت، زندہ و تابندہ اور یادگار زمانہ رہیں گی۔

حضرت شاکر وانمباڑیؒ: مولانا شاہ گنڈ و محمد عبدالقادر (ولادت ۱۲۸۲ھ وفات ۱۳۴۱ھ) وانمباڑی کے متوطن تھے۔ ان کا شمار ام المدارس مدرسۂ باقیات صالحات کے بانی و مؤسس شمس العلماء اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری (۱۳۳۷-۱۲۴۷ھ) کے ممتاز و معروف شاگردوں اور خلفاء میں ہوتا ہے۔ عالم و صوفی ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر، صاحب طرز ادیب اور نقادِ سخن بھی تھے۔ انہوں نے حضرت داغ دہلوی (متوفی ۱۳۲۲ھ) کی زمین میں سترہ (۱۷) شعر کی ایک طویل غزل کہی اور اپنے استاذ مولانا حافظ محمد یعقوب خاں مدہوشؔ کے ساتھ مسوری (دہرہ دون) پہنچ کر حضرت داغؔ کی خدمت میں بالمشافہ سنائی۔ حضرت داغ ان دنوں تفریح کے لیے ہل اسٹیشن مسوری میں تشریف فرما تھے اور حضرت شاکر کی دہرہ دون آمد بغرضِ تجارت ہوئی تھی۔ شاکر کی زبانی غزل سن کر داغؔ نے بے ساختہ کہا "جب مدراسیوں میں یہ زورِ کلام ہے تو ہم اہل زبان کیا دعویٰ کر سکتے ہیں"۔ ایک اور موقع پر انہوں نے حضرت امیر مینائی کی طرح پر غزل لکھ کر ایک خط ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ امیر مینائی نے خط کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا "مدراسی کا ایسا کلام دلکش دیکھ کر ہم اپنے کو لکھنوی کہتے ہوئے شرماتے ہیں، غزل بہت خوب ہے (تحفۂ شاکر مرتبہ عبدالرحیم طاہرؔ مطبوعہ ۱۳۲۷ھ مطبع گلزار حسنی، بمبئی۔ ۵) حضرت شاکر نے نظم و نثر میں جملہ اٹھارہ (۱۸) کتابیں تصنیف کیں، جن میں "مثنوی گلزار شاکر" (مطبوعہ ۱۳۲۶ھ مطبع شوکت الاسلام، بنگلور) کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی میں انہوں نے دکن کی مشہور عشقیہ داستان "چندر بدن مہیار" کو صوفیانہ طرز پر بڑی عمدگی اور شگفتگی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ حضرت شاکرؔ کو تاریخ گوئی میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا، انہوں نے متعدد تاریخی قطعات رقم کیے ہیں، یہاں مشہور شاعر و ادیب خطیب قادر بادشاہ وانمباڑی (متوفی ۱۳۳۳ھ) کے وصال پر کہی گئی نظم کے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

محسنی الحاج قادر بادشاہ دارِ دنیا سے لئے عقبیٰ کی راہ
شاعر خوش فکر ومداحِ رسولؐ صاحبِ دیواں تخلص بادشاہ
تھے وہ خلق اللہ میں ہر دل عزیز سب کو تھی اس یوسف مصری کی چاہ
آپ کی تاریخ شاکرؔ نے کہی ''خلد پہنچے آج قادر بادشاہ''
(تیرہ سوتینتیس)۱۳۳۳ھ

حضرت شاکر نے اپنا رسالہ ''عون العلی فی اثبات ذکر الجلی'' کے آخر میں تاریخ تصنیف بیان کرتے ہوئے درج ذیل شعر رقم کیے ہیں، جن میں مخالفینِ ذکر جلی کے لیے برملا تنبیہ اور برمحل نصیحت کی گئی ہے۔

جھگڑا ہے کیا تمہارا خدا ورسول سے کیا علم کا نتیجہ یہی زہر مار ہے
ذکر جلی و حلقہ ہے ثابت کتاب سے جھٹلانا اس کا رشک وحسد پر مدار ہے
تاریخ اس رسالے کی شاکرؔ بشان مہر کہدے کہ ''ماہ سیما صداقت شعار ہے''
(تیرہ سواڑتیس)۱۳۳۸ھ

ایک اور تصنیف ''صحیفۂ ذکر اللہ'' کے اختتام پر طویل تاریخی قطعہ تحریر فرمایا، جس کے آخری دو شعر اس طرح ہیں۔

تاریخ اس کی شاکرؔ خوش فکر سے سنو وہ تو خدا کے فضل سے روشن ضمیر ہے
''پائے حسد'' کو کر دیا جس وقت پائے مال بولا فلک ''صحیفۂ ذکر قدیر'' ہے
۸۵ (تیرہ سواڑتیس)۱۳۳۸ھ(۸۸-۱۴۲۳)

مذکورہ بالا آخری شعر میں تاریخ گوئی کی ایک قسم صنعت ''تخرجہ'' کا استعمال کرتے ہوئے مطلوبہ اعداد کا استخراج بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔

حضرت ایمان گوپامئویؒ: حضرت ایماںؔ (ولادت ۱۲۷۷ھ وفات ۱۳۵۹ھ) کا اسم گرامی نواب سراج العلماء خان بہادر تجمل حسین فاروقی اور تخلص ایماںؔ گوپامئوی ہے، والد بزرگوار حافظ شاہ ولی احمد چشتی قادری صفوی کا وصال ۱۲۶۱ھ میں اچانک ہوا جبکہ وہ سولہ سال کے تھے، اس جانکاہ حادثے سے ان کا دل بیٹھ گیا، اس لیے وطن عزیز گوپامئو (یوپی) سے ہجرت کرنے کی ٹھان

لی ۔حیدرآباد دکن میں ان کے ایک عزیز محسن الملک منصب وزارت پر فائز تھے، اس لیے اپنی والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر حیدرآباد پہنچے، اور محسن الملک کی سرپرستی میں تعلیمی مراحل طے کرنے لگے۔مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جب وہ اپنے چچا رفعت الملک بہادر (دامادِ نواب عظیم جاہ بہادر اولین پرنس آف آرکاٹ، متوفی ۱۲۹۰ھ) سے ملاقات کی غرض سے وارد مدراس ہوئے تو چچا صاحب کے اصرار پر مدراس ہی کو اپنا وطن ثانی بنالیا، ۲۳/سال کی عمر میں نواب انتظام الملک بہادر (پرنس آف آرکاٹ سوم) کی دختر نیک اختر سے ان کا نکاح ہوا اور آخر کار ۸۲ سال کی عمر میں مدراس ہی میں آسودۂ خاک ہوگئے۔

حضرت ایمانؔ نے جہاں علمائے مدراس سے علمی استفادہ کیا وہیں شمس العلماء شاہ عبدالوہاب صاحب بانی باقیات سے بھی علم حدیث و علم تصوف میں خوب فیض پایا اور حضرت بانیؒ کے دست حق پرست پر بیعت سے مشرف ہوکر خرقہ وخلافت حاصل فرمایا۔نوابین کے خاندان سے وابستہ اور رؤسائے وقت کی صف اول میں شامل ہونے کے باوجود بڑے ہی منکسر المزاج اور انتہائی متواضع تھے، جس کی وجہ سے تمام طبقات میں عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت ایمانؔ کی طبیعت میں بلا کی موزونیت تھی، فکر سخن کے وقت تخلیقی صلاحیتوں کے سرچشمے جاری ہوجاتے ۔انہوں نے اس دور کے مشہور استاذ حضرت سید ضامن علی جلال لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور استاذ محترم سے ملاقات کے لیے کئی مرتبہ لکھنؤ اور رامپور کا سفر بھی کیا۔ نثری تصنیفات میں بارہ کتابوں کا پتہ چلتا ہے جن میں ''ابتہاج فی ذکر الحسین بن منصور الحلاج'' (تذکرہ، مطبوعہ ۱۲۸۴ھ مطبع غوثیہ، مدراس) اور عقائد ایمان (مطبوعہ ۱۳۳۲ھ) کافی مشہور ہیں۔ شعری تخلیقات میں غزلیات کا دیوان (مخطوطہ) مثنوی ''اشتیاق نامہ'' (مطبوعہ ۱۳۰۲ھ) اور قصائد ایمان (مطبوعہ ۱۳۷۲ھ) قابل ذکر ہیں۔

تاریخ گوئی میں بھی قدرت کاملہ حاصل تھی، مختلف مواقع پر لاجواب تاریخی قطعات کہے ہیں، ان میں بطور نمونہ یہاں وہ قطعۂ تاریخ پیش کیا جارہا ہے، جسے حضرت علامہ ضیاء الدین امانیؔ کے منتخب فارسی دیوان کی طباعت (۱۳۳۷ھ مطبع الحمیدیہ، مدراس) کے موقع پر تحریر فرمایا تھا۔

نتائج ہائے افکار ضیاء الدین احمد بیں   کہ یک یک بیت از دیوان او بیت الغزل آمد

رقم زد مصرعِ تاریخ طبعش خامۂ ایماںؔ "زدیوانِ امانؔی انتخابِ بے بدل آمد"

(تیرہ سوستائیس) ۱۳۲۷ھ

(سالنامہ نفیر ویلور شمارہ ۱/ص ۴۸)

اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ان کی وفات کے بارہ سال بعد ان کی لائق وفائق دختر محترمہ امۃ الحی حیاؔ کی مساعیٔ جمیلہ سے ان کا دیوان قصائد (اردو) ۱۳۷۲ھ میں طبع ہوا تو جناب سید ابوالبرکات انورؔ نے تاریخی نظم کہی تھی، اس کے آخر کے تین خوبصورت شعر ملاحظہ ہوں جس سے ان کے شاگردوں میں موجود جذبۂ تاریخ گوئی کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

اقتباس آپ کے شیریں کلام کا جو حضرت حیاؔ کی مساعی کی ہے مثال
سرمایۂ زباں بھی ہے، نعت رسولؐ بھی اس کو پڑھے ہر ایک جواں، پیر وخردسال
انورؔ سے فی البدیہ کہا جبرئیل نے "نذر رسولؐ، ہدیۂ ایماں" ہے اس کا سال

(تیرہ سو بہتر) ۱۳۷۲ھ

(عقائد ایماںؔ مطبوعہ ۱۳۳۷ھ مدینہ پریس، مدراس)

حضرت سفیرؔ بلنج پوریؒ: حضرت مولانا قاضی خطیب محمد اعظم سفیرؔ بلنج پوری فرزندِ حضرت مولانا قاضی خطیب محمد یعقوب کا وطن مالوف شہر ویلور سے تقریباً بارہ کلومیٹر دور شمالی سمت میں واقع ایک چھوٹا سا مگر مردم خیز قصبہ "بلنج پور" (Viranjipuram) ہے جو اس لیے بھی تاریخ کے حافظہ کا حصہ بن چکا ہے کہ وہاں ۱۴/اپریل ۱۶۴۶ھ کو سلطنت بیجاپور کے سپہ سالار "مصطفیٰ خاں" اور آثارِ وجیانگر کے وارث وقلعہ دار ویلور سری رنگ (سوم) کے درمیان زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں "خان موصوف فتح یاب ہوا تھا، (ویلور تاریخ کے آئینہ میں از ڈاکٹر راہی فدائی)۔ حضرت سفیرؔ اس مختصر آبادی کی دینی وملی ضروریات کی تکمیل کرنے کے علاوہ شعر وسخن کی آبیاری اور علم وادب کی چمن بندی میں بھی اپنا قیمتی وقت صرف کیا کرتے تھے۔

حضرت سفیرؔ کی تعلیم وتربیت کا سفر اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب ویلوری (۱۹۱۹ء-۱۸۳۱ء) کی سرپرستی میں فراغت تک جاری رہا، جس سے ان کے اندر منزل مقصود کا عرفان اور مزاج میں جودت طبع ووسعت فکر کی اعلیٰ شان پیدا ہوگئی۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے بڑے ہی انکسار کے

ساتھ فرمایا۔

تلمیذ ایک ادنیٰ ہوں میں اس جناب کا ذرہ ہوں گرچہ پایا ہوں فیض آفتاب کا

شعر وادب کا شستہ وشائستہ ذوق رکھتے تھے، ''مخزن اعظم'' کے نام سے اپنا نعتیہ مجموعہ دو جلدوں میں مطبع شوکت الاسلام، بنگلور سے شائع فرمایا اور ''چمنستان اعظم'' کے عنوان سے قصائد کے دو مجموعے مذکورہ مطبع ہی سے چھپوائے تھے۔ ان کے ایک شاگرد جناب وی محمد عبداللطیف صاحب ولد جناب وی محمد یعقوب صاحب مرحوم نے ان کے قصائد کا ایک اور مجموعہ ''خیابان لطیف'' ۱۳۳۴ھ میں مذکورہ مطبع ہی سے شائع کروایا تھا، علاوہ ازیں ان کی ایک گراں قدر نثری تصنیف ''فتح الودود فی اثبات المولود'' مطبع رزاقی، کانپور سے ۱۳۱۷ھ میں بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی۔ ان کا فارسی کلام نایاب ہے مگر ''فتح الودود'' میں ایک نعتیہ رباعی محفوظ ہوگئی ہے جو ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے:

اے ختم رسلؐ شاہ کونین توئی سرِّ دو جہان و دُرِّ بحرین توئی

ہر شب ملک از فلک زمیں بوس کند شاہنشہِ قاب قوسین توئی

تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی، چنانچہ اپنے استاذ اعلیٰ حضرت کی وفات حسرت آیات پر ایسی عمدہ تاریخیں کہی ہیں جس سے ان کی قادر الکلامی ثابت ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

شمس علماء مولوی عبدالوہاب خدمتِ دینی سے پایا جب فراغ

چل بسے دنیا سے وہ ملک بقا کر عطا مولیٰ انہیں جنت کا باغ

بزم علما میں یہی ہے گفتگو حیف، دل پر ہے ہمارے ان کا داغ

کہہ دیا ہاتف سفیرؔ اب سال فوت ''ہوگیا ہے آہ گل زیبا چراغ''

(تیرہ سوسینتیس) ۱۳۳۷ھ

شمس علما عارف وہادی ومفتی نامدار اس جہاں سے عازمِ گلزار رضواں ہوگیا

جس وجود پاک سے پائے تھے فیضانِ علوم آہ، اس کے فوت سے تاریک دوراں ہوگیا

بست ودوم تھی ربیع آخریں کی، وقت شام وائے حسرت، داخلِ شہرِ خموشاں ہوگیا

سالِ رحلت کہہ دیا ہاتف سفیرؔ افی البدیہہ ''آفتاب ''مجمع الحسنات' پنہاں ہوگیا''

(تیرہ سوسینتیس) ۱۳۳۷ھ

(''فغان اعظم''، مطبوعہ ۱۳۳۷ھ مطبع شوکت الاسلام، بنگلور، من جانب اہل اسلام، بلنج پور)

حضرت شاہ اسماعیل ویلوریؒ: حضرت حکیم شاہ محمد اسماعیل ویلوری حضرت سفیر بلنج پوری کے ہم عصر و ہم ذوق تھے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ محمد لطف اللہ ویلوری کی سرپرستی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، بعد ازاں اعلیٰ حضرت بانی مدرسہ باقیات صالحات علیہ الرحمہ کی خدمت میں باریاب ہو کر علوم متداولہ سے فیضیاب ہوئے۔ حضرت بانی مدرسہ نے چونکہ شہر ویلور کے نامور حکیم حضرت علامہ زین العابدین مائل ویلوری سے فن طب و حکمت میں مہارت حاصل کی تھی۔ اس لیے شاہ اسماعیل نے حضرت بانی ہی کو علم طب کے حصول کے سلسلہ میں اپنا رہبر و رہنما بنالیا۔ چنانچہ تعلیم طب سے فراغت کے بعد حضرت بانی نے شاہ اسماعیل کو مشورہ دیا کہ وہ تروپتی (آندھرا) جا کر دعوت و ارشاد کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے طب یونانی کے ذریعہ خلق اللہ کی خدمت کا فریضہ انجام دیں۔

حضرت اسماعیل نے اپنے استاذ و شیخ کے انتقال پر ''فراق نامہ فخر العلماء'' کے تاریخی نام سے ایک طویل مثنوی تحریر کی تھی جس میں وفات کی متعدد تاریخیں کہی ہیں ان قطعات کے ملاحظہ سے اس فن میں ان کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

سال ترحیل شاہ عبد وہاب ۔۔۔ جستجو میں نے کی بوجہ صواب
ہاتفِ جاں کیا ہے دل سے خطاب ۔۔۔ کیا تجسس ہے تجھ کو اب دریاب
سال یہ باعث کروب ہوا ۔۔۔ ''اب وہ نجمِ ہُدا غروب ہوا''

(تیرہ سوسینتیس) ۱۳۳۷ھ

وادریغا، جب گئے یہ دارفانی چھوڑ کر ۔۔۔ سوئے جنت شمسِ علما، ہادیٔ راہِ ہدیٰ
عالم بالا سے سالِ عیسوی در فوت شیخ ۔۔۔ ''غاب قطب الوقت ویلوری بجا'' آئی ندا

(انیس سوانیس) ۱۹ ۱۹ء

شاہ صاحب نے مذکورۂ بالا قطعے میں بہترین سن عیسوی برآمد کیا ہے جس سے فن تاریخ گوئی پر ان کی دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ہوا جب راہیِ فردوس قطب الہند شیخ الوقت بہایا اشک آنکھوں سے ہر اک خرد و کلاں ہے ہے
ندا آئی فلک سے از پئے منقوطہ سالِ وصل ”فراق فخر علما ، ماتم اہل زماں ہے ہے“
(تیرہ سوسینتیس) ۱۳۳۷ھ

شاہ اسماعیل نے مذکورۂ بالا قطعے میں مصرعِ اخیر کے حروف منقوطہ سے مطلوب تاریخ کا اخراج بڑے کمال فن کے ساتھ کیا ہے۔

کر قلم راسِ الم لے سالِ فوت ”فخر ہند اب قدسیاں سے مل گیا“
ا (تیرہ سوسینتیس) ۱۳۳۷ھ=۱-۱۳۳۸

اوپر ذکر کردہ شعر کی خوبصورتی دیکھئے کہ کس نرالے اور لطیف انداز میں الم الف کے عدد ایک کو منہا کر کے سالِ وصال نکالا گیا ہے، اس طرح کا شعر فن پر مکمل قدرت کے بغیر ممکن نہیں۔ شاہ صاحب کو فارسی اور عربی میں تاریخ گوئی پر بھی کامل درک حاصل تھا، یہاں نموتاً اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

ملہمِ غیب گفت سالِ وصال ”غاب قطبِ زماں ، ولیٔ دکن“
(تیرہ سوسینتیس) ۱۳۳۷ھ

فکر تاریخِ وصالش کردہ ام چہ شود از ہاتف دل مستبیں
ناگہاں آمد ندا در گوشِ من بَـوْنَ قُطبِ الْهِنْدِ شیخِ الْعَابِدِیْن
(تیرہ سوسینتیس) ۱۳۳۷ھ

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم ویلوریؒ: حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم باقوی قاسمی ویلوری (ولادت ۱۳۰۲ھ وفات ۱۳۶۷ھ)۔ شیخ طریقت وشیخ الحدیث ومہتمم (ناظر ثالث) مدرسۂ باقیات صالحات کو اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمہ کے علاوہ مولانا غلام محی الدینؒ، مولانا عبدالقادر بادشاہؒ، علامہ شمس العلماء عبدالجبارؒ، مفتی اعظم شیخ آدمؒ اور بہنوئی مولانا کمال الدینؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اپنے دوست مولانا عبدالکریم (بانی مدرسۂ مصباح الہدیٰ، نیڈور، تمل ناڈو) کے ہمراہ ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں سے مکمل چھ سال بعد ۱۳۳۰ھ میں ویلور لوٹ آئے، بعدازاں حضرت ناظر ثانی علامہ قاری ضیاءالدین محمد فرزند اعلیٰ حضرت بانی باقیات نے

اپنی سرپرستی میں لیتے ہوئے ۱۳۳۱ھ میں ان کا تقرر بحیثیت استاذ مدرسہ کر دیا۔ اور شرفِ دامادی بھی بخشا۔ بڑے ہی منکسر المزاج اور انتہائی متواضع تھے۔ طبیعت میں غنائے نفس اور توکل کا جذبہ غالب تھا۔ رواداری و پرہیزگاری امتیازی شان تھی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد بانی مدرسہ علیہ الرحمہ سے تصوف کے اعلیٰ درجہ کی کتابیں پڑھی تھیں۔ اور مدرسہ کا نصاب مطول مکمل کیا تھا۔ اسی لیے اختلافی مسائل میں ہمیشہ اعتدال کی راہ پر گامزن رہے۔ باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے، مگر اپنے شاگردوں میں شعری ذوق اور ادب سے دلچسپی پیدا کرنے میں سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔ نسبتی برادر محترم نورالدین احمد عرف بادشاہ (ولادت ۱۳۲۱ھ وفات ۱۳۴۶ھ) پدر بزرگوار حضرت مولانا الحاج رئیس الاسلام صاحب باقوی سابق مدرس مدرسہ باقیات (متوفی ۱۴۳۳ھ) کے نکاح پر فلاح منعقدہ ۲۲/ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ کے مبارک موقع پر ان کے ایک عزیز شاگرد مولانا محمد تمیم ملیباری نے ایک طویل تہنیت نامہ بزبان عربی رقم کیا تھا، جس میں انہوں نے شادی کی عمدہ تاریخ نکالی تھی، اس سے فن تاریخ گوئی میں موصوف کے کمالِ درک کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں صرف دو شعر نقل کیے جارہے ہیں جس میں دولہے کے نام ''نورالدین'' کو سن تاریخ کا جزء بنایا گیا ہے:

تَـفَـكَّـرْتُ فِـى تَـارِيْخِ عَقْدِ نِكَاحِهٖ بِـمِـصْـرَاعِ بَيْتٍ مِنْ قَوَاعِدِ اَبْجَدُ

"هَنِيْئًا لِنُوْرِ الدِّيْنِ بِالْخَيْرِ وَالْبَهَا" وَنَيِّفْ عَـلَـيْـهِ الْخَمْسَ فَوْرًا وعَدّد

(تیرہ سو انچالیس) ۱۳۳۹=۵+۱۳۳۴ ۵

ایک اور شعر میں مولانا تمیم صاحب نے نکاح کے دن اور مہینے کی بھی الفاظ میں صراحت کر دی ہے، ملاحظہ ہو:

بِـطَـالِـعِ سَـعْـدٍ يَوْمَ اَحَدٍ بِسَادِسٍ وَعِشْـرِيْنَ مِنْ ذِى الْحَجِّ شَهْرٍ مُسَعَّدٍ

آخر میں شاعر موصوف نے اپنے نام کو اس طرح بیان کیا ہے:

اَنَـا الـنَـاظِمُ الْعَاصِى الْفَقِيْرُ مُحمدٌ تَـمِـيْمٌ هَـدَاهُ الـلّٰـهُ مَسْلَكَ رُشْـدٍ

مولانا محمد تمیم نے اپنے استاذ گرامی حضرت شمس العلماء ابوالجلال محمد غلام محی الدین آتوری (صدر مدرس مدرسۂ باقیات) برادرزادۂ اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمہ کے انتقال پُر ملال پر تقریباً اَسّی (۸۰) اشعار پر مشتمل فصیح و بلیغ تعزیتی نظم تحریر کی تھی۔ جس کے آخر میں درج ذیل بے مثال قطعۂ

تاریخ رقم کیا ہے۔اشعار کے مطالعے سے زور قلم اور فنی مہارت کا ادراک ہوتا ہے:

وَذَاكَ شَيْخٌ تُسَمّٰى بِاسْمِهِ الأسمٰى   غُلَامُ مُحْيِ لِدِيْنٍ طَابَ عُنْوَانَا

صَبِيْحَةَ الْيَوْمِ الْاِثْنَيْنِ قَدْ قُبِضَا   فَفَارَقَ الْاَهْلَ وَالْاَوْلَادَه اَوْطَانَا

فَرَاحَ رَوْحٌ لَهٗ فِيْ اَوَّلِ الصَّفَرِ   فِيْ عَامٍ "نَالَ نَعِيْمًا زَادَ رِضْوَانَا"

(تیرہ سو بائیس)۱۳۲۲ھ

مرثیہ کے آخر میں انہوں نے اپنا تخلص بیان کرتے ہوئے دعائیہ شعر اس طرح کہا ہے:

اِنِّيْ تَمِيْمٌ اِلٰهِيْ تَمِّمَنَ اَمَلِيْ   دِيْنًا وَدُنْيَا وَلَا تَجْعَلْهُ مَجَّانَا

(تذکرۂ ابوالجلال مصنفہ ابوالکمال مولانا محمد حبیب اللہ باقوی ندوی مطبوعہ ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء مطبع علوی آمبور)

حضرت سعید صاحب قبلہؒ: حضرت علامہ سید محمد سعید و شارمیؒ (متوفی ۱۳۹۳ھ) سابق مدرس مدرسہ باقیات صالحات، ویلور، اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمہ کے تلمیذ رشید تھے، ایک جید عالم ہونے کے ساتھ باتصرف بزرگ اور عاملِ باکمال بھی تھے، خلقِ خدا کی ایک کثیر تعداد فیوض و برکات سے استفادہ کرتی رہی، ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے کہ چند تلامذہ نے جن میں مولانا عبدالغفور باقوی (بانی و مہتمم دارالعلوم فاروقیہ عربک کالج، کولار)، مولانا حلیم اللہ بیگ باقوی (بانی و مہتمم مدرسہ دارالفلاح، رحمت نگر، بنگلور)، مولانا کلیم اللہ بیگ باقوی (سابق مدرس دارالعلوم سبیل الرشاد، بنگلور) شامل تھے اور مدرسہ میں جماعت سوم میں زیر تعلیم تھے۔ بغرض استفادہ سوال کیا کہ حضرت! کیا اوراد و وظائف سے اس دنیائے دارالاسباب میں کوئی غیر معمولی فرق پڑتا ہے؟ اس پر حضرت والا نے عبدالغفور صاحب سے فرمایا کہ مدرسہ کے مطبخ (کچن) سے کوئلہ کا ایک ٹکڑا لے آئیں اور سامنے پڑی ہوئی پتھر کی سل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کے درمیان کوئلہ کی لکیر کھینچیں، چنانچہ موصوف نے حضرت کے حکم کی تعمیل کی، بعد ازاں وہ ایک طرف کھڑے ہوگئے اور ہاتھ میں تسبیح لے کر کچھ پڑھتے ہوئے آہستہ آہستہ دوسری طرف آ گئے، طلبہ نے دیکھا کہ جہاں لکیر تھی وہاں اب چٹان کے پھٹ جانے سے دراڑ پڑ گئی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر شاگرد مبہوت رہ گئے اور حضرت قبلہ کے تصرف باطنی کے قائل ہوگئے۔ سادگی اور بےلوثی اوصاف حمیدہ میں نمایاں تھی۔

شعروسخن سے دلچسپی تو تھی مگر شعر گوئی کی عادت نہیں تھی۔ البتہ وقت ضرورت اشعار بے تکلف کہتے تھے، تاریخ گوئی میں خاصہ ملکہ حاصل تھا، نظم کے علاوہ نثری جملوں سے بھی بے ساختہ تاریخ برآمد کرتے تھے، حضرت بانی علیہ الرحمہ کے فرزند حضرت خان بہادر علامہ قاری ضیاء الدین محمد کے انتقال پُر ملال پر ''اظہار رنج'' (۱۳۶۰ھ) کے تاریخی عنوان سے ایک مرثیہ تحریر کیا تھا جو مطبع محمدی ترملگھری (Triplicane)، مدراس، سے ۱۹۴۱ء میں طبع ہوا۔ مذکورہ نظم کی ابتداء میں اعلیٰ حضرت ثانی مولانائے مرحوم کے نام نامی سے ہجری سال وصال اوران کے منصب کے ذکر سے عیسوی سن رحلت کا بخوبی استخراج کیا ہے جس سے اس فن میں ان کے کمال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

''الحاج ضیاء الدین محمد رحمہٗ اللّٰہ'' ''ناظر جلیل القدر دارالعلوم''

(تیرہ سوساٹھ) ۱۳۶۰ھ (ایک ہزار نوسو اکتالیس) ۱۹۴۱ء

مرثیہ کے آخری دو شعر اس طرح ہیں:

مرقدِ اقدس پہ ان کے سائباں رحمت ہوئی ذوالمنن کی خلد میں قربت ہوئی، رویت ہوئی

''رحمتِ یزداں ضیاء الدیں محمد پر ہوئی'' کہہ دیا ملہم نے سن، ترحیل جس ساعت ہوئی

(انیسویں سو اکتالیس) ۱۹۴۱ء

مولانا محمد بشیر منجیریؒ: یہ مدرسۂ باقیات کے فاضلین میں سے تھے، فراغت کے بعد مدرسۂ منبع الہدیٰ، کوتانلور (تمل ناڈو) میں ایک مدت تک تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر وطن عزیز ملیبار ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا شمار کیرالا کے ممتاز علماء وصلحاء میں ہوتا ہے۔ دوران تعلیم ہی سے شاعری کا صالح ذوق رہا ہے۔ اپنے مشفق استاذ وناظر مدرسہ حضرت علامہ مفتیٔ اعظم شیخ آدمؒ کی وفات حسرت آیات پر عربی میں ایک پُر اثر مرثیہ لکھا تھا، جس میں بڑے ہی سلیقہ اور انتہائی مہارت سے تاریخ وفات نکالی تھی۔ یہاں اس مرثیہ کے چند منتخب شعر پیش کیے جارہے ہیں:

واللہ یعلم ما فی القلب من الم من غیب شمس الھدیٰ والدین والعلم

والموت یشملنا والقبر یجمعنا والعمل یتبعنا والباقی کالعدم

ومنهم وليّ نور العلم والعمل   وداوم تبليغ العلوم مع الحكم
اعنی به شيخ الشيوخ شيخنا   شيخ آدم حضرت قدس الله سرهم
تاريخه" غفر الله له "حازا   والله يجمعنا فی جنة النعم
(تیرہ سو اکیاسی) ۸۱ ھ ۱۳

حضرت مفتی اعظم شیخ آدمؒ کا سال وفات درحقیقت ۱۳۸۰ھ ہے، مذکورہ مصرعے میں ایک عدد کی زیادتی بشری تسامح کی واضح دلیل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت علامہ علمی باقویؒ: حضرت علامہ فخر الشعراء حافظ قاری الحاج عبدالصمد (متوفی ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء) کا وطن مالوف شہر مدراس کے مضافات میں واقع قبضۂ "پٹ" ہے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت بانی باقیات علیہ الرحمہ کے علاوہ شیخ المعقولات شمس العلماء شیخ عبدالجبار صاحب باقوی (متوفی ۱۳۵۳ھ) حضرت مفتی اعظم شیخ آدم باقوی (متوفی ۱۳۸۰ھ)، شیخ التفسیر علامہ حسن باشا باقوی (متوفی ۱۳۷۳ھ)، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب باقوی قاسمی (متوفی ۱۳۶۷ھ) سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا، بعدازاں ان کی صلاحیتوں کے مدنظر اعلیٰ حضرت نے مدرسہ باقیات میں نہ صرف منصب تدریس پر فائز فرمایا بلکہ خرقۂ خلافت سے بھی نوازا۔

عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے ماہر تھے مذکورہ تینوں زبانوں میں خوب طبع آزمائی کی، چنانچہ مثنویاں لکھیں، قصیدے اور مراثی رقم کیے۔ "لامیۃ العلمی" "القصیدۃ البائیۃ (مطبوعہ ۱۳۵۵ھ در مطبع حقانی مدراس)" "دالۃ العلمی" "سمنستان، ردّ ملحد رحلت شیخ ویلور" وغیرہ کتب و رسائل یادگار ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں یدطولیٰ حاصل تھا، اپنے شیخ کی وفات پر جو تاریخیں کہی ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فن کے امام تھے۔ یہاں چند منتخب شعر پیش کیے جارہے ہیں:

ہر غم کی اس قدر ہے کہاں طاقت و مجال   جو وہ کرے جہاں کو پراگندہ حال و قال
ہر موت پر تو خلق بہاتی نہیں ہے اشک   ہر فوت سے ہوتی نہیں آنکھیں خوں سے لال
وہ انتقال ہوش رُبا ہے اگر کہیں   ہے انتقالِ شیخ جو تھا قوم کا مآل
اس غم سے جملہ خلق بنے نوحہ خواں، بجا   اس غم سے لوگ دل کو کریں شق تو حسبِ حال
ہاتف نے مجھ کو درد و غم و رنج سے کہا   " خورشید علم آہ ہوا ہے زوال" سال

(تیرہ سوسینتیس) ۳۷ ھ ۱۳

اعلیٰ حضرت کے یوم زیارت کے موقع پر منعقدہ جلسۂ تعزیت میں پڑھا گیا قطعہ درج ذیل ہے:

علم کی خدمت میں اس نے عمر اپنی صرف کی — آج ہے یہ ''باقیات صالحات'' اس کی مثال
سن کے ہاتف کی زبانی دل سے میں غمگیں ہوا — ''شمس علما کی زیارت جلوہ افزا ہے'' یہ سال

(تیرہ سوسینتیس) ۳۷ ھ ۱۳

ایک اور قطعہ جس میں کمال ہنر کا جلوہ صاف نظر آرہا ہے، نذر قارئین ہے:

رحلت فخرِ زماں سے افسوس — ہوگیا راغ وہ باغِ دیں آج
جرعۂ علم و شرابِ حق سے — ہوئے خالی ہیں ایاغِ دیں آج
ہجر سے اس کے زمیں سے دردا — متحیر ہے دماغِ دیں آج
سالِ تاریخ ہواتف سے سنا — ''بجھ گیا کاج چراغِ دیں آج''

(تیرہ سوسینتیس) ۳۷ ھ ۱۳

عیسوی تاریخ پر مشتمل قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو:

شمس علما جب ہوئے ہیں راہیٔ دارالبقا — درد و غم دنیا میں پھیلے اور ہیں آئے کروب
شیونی اب ہے جنوب اور ماتمی اب ہے شمال — رخت باندھے ہیں خوشی وشادی وعیش وطروب
قامعِ بدعت وہ تھے اور دافعِ رنج و فساد — قاطعِ بیخِ جدال اور فیصلہ بخشِ حروب
عیسوی سن کو کہا ہاتف نے ہو افسردہ دل — ''ہوگیا ہے آفتابِ علم کا آہ اب غروب''

(انیس سوانیس) ۱۹ ء ۱۹

ایک فارسی قطعۂ تاریخ کا یہ شعر طبع موزوں کا شاہد عدل اور پوری صداقت پر مبنی ہے:

بہ تبدیلِ حرفے زمصحف بخواں — ''فقد فاز فوزا عظیما'' سنش

(تیرہ سوسینتیس) ۳۷ ھ ۱۳

(''رحلت شیخ ویلور'' مطبوعہ ۱۹۱۹ء در شاہ الحمید یہ پریس، مدراس)

حضرت علمی نے فخر الواعظین، سر آمد شعرائے ماہرین، سرکردۂ فقہاء ومحدثین، استاذ الاساتذہ

علامہ حافظ قاری الحاج عبدالقادر بادشاہ فخر ویلوری کی وفات حسرت آیات پر ایک مرثیہ بزبان فارسی کہا تھا، جس میں مرقوم لاجواب قطعۂ تاریخ فنی وفکری علوِشان کا بین ثبوت ہے:

مخلص من ! داستانِ چرخ بیدادی مگوے بادۂ عشرت مخواہ وجادۂ شادی میوے

زانکہ شاہِ ما گذشت ازمن شنوسالِ وفات راہئ فردوس شد آں پادشاہِ نیک جوے

اپنے استاذ زادے محترم محمد امین ابن حضرت مفتی اعظم شیخ آدم (ناظر مدرسۂ باقیات صالحات) کی تقریب شادی خانہ آبادی منعقدہ بتاریخ ۱۷محرم الحرام ۱۳۶۵ھ کے موقع پر ایک تہنیتی نظم بزبان عربی پڑھی تھی، جس میں سنِ عقد کا استخراج بڑی ہنرمندی سے کیا ہے، ملاحظہ ہو:

"هَـذَا الْـعَـقْـدُ مُـجْـتَـبِـى" تَـارِيْـخُـه فِـىْ سِـرِّ قَـلْـبِـىْ اِنَّــهٗ اَلْاِلْـقَــاءُ

(تیرہ سو پینسٹھ) ۱۳۶۵ھ

خُـذْ هٰـذِهِ اْلاَشْـعَـارَجَهْدًا اِذْ حلَتْ قَـدْ قَــالَهَــا الْـعِـلْـمِــىْ وِهِـىَ لِفَـاءُ

("وردالتبریک" مطبوعہ ۱۳۶۵ھ مطبع اختر پریس، بنگلور)

حضرت علامہ امانی باقویؒ: شیخ الملۃ ضیاء الادب علامہ ضیاء الدین احمد امانی (ولادت ۱۳۱۱ھ وفات ۱۳۸۶ھ) اعلیٰ حضرت بانیٔ باقیات علیہ الرحمہ کے تلامذہ میں اس لئے ممتاز ومشہور ہیں کہ انہوں نے نہ صرف عربی، فارسی اور اردو زبان کے ماہر کی حیثیت سے علمی دنیا میں اپنا لوہا منوایا بلکہ تمل زبان وادب اور اس کے قواعد نحو وصرف پر بھی گرانقدر تحقیقی خدمات انجام دے کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا، مدرسۂ باقیات صالحات سے فراغت (۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء) کے بعد اعلیٰ حضرت نے مادر علمی ہی میں خدمت درس وتدریس کی ذمہ داری سونپی اور شرف بیعت سے مشرف کیا، اعلیٰ حضرت کا وصال (۱۳۳۷ھ) مریدوں، معتقدوں اور شاگردوں کے لیے ایک جانکاہ حادثہ سے کم نہ تھا، حضرت امانی نے اپنے شدید احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:

حسرتا! آج ہے اک مردِ خدا کا ماتم خضرِ راہ و سراج العرفا کا ماتم

مرشد و قبلہ گہہ و شمع ہدیٰ کا ماتم عبد وہاب کا شمس العلما کا ماتم

ہائے! پھر ہم کو ملے آپ سا استاذ کہاں کون بتلائے ہمیں رمز حدیث و قرآں

وادریغا، کہ کہیں کس سے ہم اب دردنہاں اللہ اللہ کہ نہیں ہم کو ہے تابِ ہجراں

(''رحلت شیخ ویلور''ص:۳۰۔۳۱مطبوعہ ۱۹۱۹ء مطبع محمدیہ، مدراس)

شیخ ویلور کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع کیا اور پھر حضرت کے انتقال کے بعد انہیں کے خلیفہ مولانا محمد سعید کیرنوری (تمل ناڈو) کے ہاتھوں خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔ام المدارس مدرسۂ باقیات میں ربع صدی تک تدریسی خدمات انجام دیں بعد ازاں وہ جامع منبع الانوار لال پیٹ، تمل ناڈو (قائم شدہ:۱۳۸۱ھ) منتقل ہوگئے اور پھر وہیں علمی مصروفیات میں دم آخریں تک رہ کر واصل بہ حق ہوئے۔

علامہ امانی کا علمی قد فلک بوس ہے،علوم معقول ومنقول کے علاوہ علم فلکیات پر کامل عبور حاصل تھا،معرفت قبلہ اور ہیئت و ہندسہ میں بالترتیب ''عمدۃ الادلۃ فی مواقیت الصلوٰۃ وسموت القبلہ'' اور ''الکرۃ المیشرۃ'' جیسی گرانقدر کتابیں تصنیف کیں،نظم ونثر پر یکساں قدرت حاصل تھی،بیس سے زائد کتابیں تحریر کیں،جن میں ''گلشن سیرت'' (سیرت منظوم اردو حصہ اول ودوم، مطبوعہ ۱۳۶۷ھ اور ۱۳۶۹ھ) انتخابِ دیوان امانی فارسی (مطبوعہ ۱۳۳۷ھ) مرثیہ اعلیٰ حضرت، عربی (مطبوعہ ۱۳۳۷ھ) اور ''زجرالامم'' (مطبوعہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء) مشہور ومقبول ہیں۔

علامہ امانؔی بلند پایہ شاعر و نقاد ہونے کے ساتھ ماہر غالبیات بھی تھے،علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی (۱۹۳۳ء۔۱۸۵۲ء) کے مرزا غالب پر کیے گئے اعتراضات کا مدلل ومسکت جواب دیا جس کو ہندوستان بھر کے اہل علم نے بے حد پسند کیا۔حتیٰ کہ جب اپنے قیام حیدرآباد کے موقع پر علامہ نظم طباطبائی سے ملاقات کر کے مختلف ادبی موضوعات پر خصوصاً شرح غالبؔ کے مندرجات پر گفتگو کی تو علامہ نظم کی فراست وقوت حافظہ اور گفتگو کے سلیقہ سے کافی متاثر ہوئے اور فرمایا کہ ''آپ کی نظر بہت بلیغ ہے''۔(ماخوذ از ماہنامہ ''معیار ادب'' بنگلور مدیر محوی صدیقی لکھنوی، شمارہ مارچ ۱۹۸۲ء ص:۳۵) مضمون ''غالب وطباطبائی'' از علامہ امانؔی باقوی)

علمی وادبی مضامین اس وقت کے موقر معیاری جرائد مثلاً نیرنگ خیال،ادبی دنیا،جلوۂ یار،جلوۂ سخن،ریاض الاخبار،مصحف،الناظر وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے جس سے ہند کے طول وعرض میں بحیثیت نقاد متعارف ومشہور ہوگئے۔شاعری کے علاوہ فن تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔مختلف احوال وآثار پر تاریخیں کہی ہیں،یہاں ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے مصداق چند

مثالوں کا ذکر کیا جارہا ہے تا کہ اس فن لطیف پر ان کی خلاقانہ گرفت کا علم ہو سکے۔

اپنے استاذ و مرشد کی وفات پر چھہتر (۷۶) اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ عربی میں لکھا تھا جس کے سرورق پر آیت کریمہ "والملائكة يدخلون عليهم من كل باب الخ سے مستنبط جملہ "يدخل الملائک عليه من كل باب سلام عليكم" سے سال رحلت ۱۳۳۷ھ برآمد کیا ہے۔ اس طرح قرآنی آیت "ان المتقين فی جنات وعيون" تصور میں رکھتے ہوئے "ان للمتقين لجنات وعيون" کے بامعنی جملے سے سن وفات (تیرہ سو سینتیس) ۱۳۳۷ھ کا استخراج کیا ہے۔ (مرثیہ مرشدنا ومولانا الحاج شاہ عبدالوہاب ویلوری، مطبع کریمی، مدراس)

اپنے یار غار اور مخلص ترین دوست حضرت علامہ عبدالصمد علمی کی رحلت پر قطعہ ہائے تاریخ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اس خوبی کے ساتھ کہے ہیں جس سے سالِ رحلت کے علاوہ مرحوم و مغفور کے علمی و ادبی کمالات مترشح ہوتے ہیں:

حسرتا ، پھر کہاں وہ گرمیٔ بزم مئے سے خالی ہوا ایاغِ علم
اب ہیں گم کردہ راہ، طالبِ فن پائیں گے کس طرح سراغِ علم
فی البدیہی کہا اماؔنی نے سالِ رحلت " بجھا چراغِ علم"
(تیرہ سو پینسٹھ) ۱۳۶۵ھ

عربی نظم کا آخری شعر اس طرح کہا ہے:

لَمَّا تَوَفَّتْكَ الْمَلَائِكُ بَغْتَةً اَرَّخْتُ حَرْفًا "مَاتَ شَيْخٌ اَجْوَدُ"
(تیرہ سو پینسٹھ) ۱۳۶۵ھ

(ماخوذ از: "الکرب العظیم"، مطبوعہ ۱۳۶۵ھ در مطبع آفتاب، مدراس)

ایک اور مرثیہ حضرت مکان قطب ویلور کے سجادہ نشین اعلیٰ حضرت ابوالفتح سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادر قادری کی وفات حسرت آیات پر حضرت اماؔنی نے فارسی میں رقم کیا تھا جس کے منتخب شعر یہ ہیں، اس قطعہ منظوم کے آخری شعر کی معنوی لطافت قابل دید و لائق تحسین ہے:

یادِ احمدؐ تازہ بود از رویتِ سبطِ رسول صادق است ایں قول بوئے گل بجویم از گلاب

درندائے پاک رضواں ہیں اماؔنی سالِ وصل   برلبش ''یااہل غفراں'' بود و کردہ فتح باب

(تیرہ سواٹھہتر) ۱۲۷۸ھ

وہ جس وقت قصبہ لال پیٹ کے مدرسۂ ''منبع الانوار'' تشریف لائے تو ان کے قلم معجز رقم سے ایک بہترین قطعہ تاریخ نکلا جس سے مدرسہ کی تاسیس کا سال واضح ہوجاتا ہے:

بَنٰی رَبِّیْ لِعِلْمِ الدِیْنِ قَصراً   وَکُلُّ الطَّالِبِیْنَ لَہٗ اِسْتَحَقَّا

فَقَالَ النَّاسُ حِیْنَ الْفَتْحِ ارخًا   ''ذُکَاء مَنْبَعُ الْاَنْوارِ حَقًّا''

(بارہ سو اکیاسی)۱۲۸۱ھ

ہندوستان کی مشہور و معروف دینی درسگاہ دارالعلوم سبیل الرشاد، بنگلور جوآج یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کرچکی ہے، اس کے بانی و مہتمم امیر شریعت (اول) حضرت علامہ حافظ قاری ابوالسعود احمد باقوی (متوفی ۱۴۱۷ھ) کا شمار اہل دل میں ہوتا ہے، وہ علامہ اماؔنی کے داماد ہیں۔ جب سبیل الرشاد کے قیام کی تاریخ کے لیے اپنے خسر محترم سے درخواست کی، تو علامہ اماؔنی نے برجستہ خوبصورت اور بامعنی عربی قطعہ کہا جو حسب ذیل ہے:

بَنٰی لِنَشْرِ الْعُلُوْمِ قَصرًا   اِلٰھُنَا مُرْشِدُ الْعِبَادِ

فَحِیْنَ مَا زُرْتُ اَرَّخْتُ   ''ذَا سَبِیْل اِلٰی الرَّشَادِ''

(تیرہ سو اسّی)۱۲۸۰ھ

(باقی)

تذکرۃ المحدثین (حصہ اول تا سوم)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

حصہ اول: (جدید ایڈیشن) قیمت:۲۰۰روپے

حصہ دوم: (جدید ایڈیشن) قیمت:۲۲۵روپے

حصہ سوم: ہندوستان کے صاحب تصنیف محدثین کے حالات پر قیمت:۱۲۵روپے

قیام امن سے متعلق عیسائیت کی تعلیمات اسلام کے تناظر میں

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

مذاہب عالم میں عیسائیت یا مسیحیت وہ مذہب ہے جو امن و عدل، انسانیت نوازی اور بشر دوستی کا دعوے دار ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظلم و عدوان کے استیصال میں اور امن و آشتی کی خوشگوار اور مبارک صورت حال کے فروغ میں عیسائیت کی تعلیمات کس حد تک مثبت اور شایان انسانیت رول ادا کرتی ہیں۔ اس مقالے میں قیام امن و عدل سے متعلق اسلامی تعلیمات کے تناظر میں عیسائیت کی ان تعلیمات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو بشر دوستی اور انسانیت نوازی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں اور جنہیں مسیحیت کے افکار و عقائد اور تعلیمات و ہدایات میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔

مخلوقات ارضی و سماوی میں انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی سعادت حاصل ہے (۱)۔ کائنات کی ساری چیزیں معزز ترین مخلوق انسان کی خدمت پر مامور ہیں اور بایں طور وہ اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر رہی ہیں۔ انسان جو مخدوم کائنات ہے اس کے شرف و سعادت کا راز اس صداقت میں پنہاں ہے کہ وہ ہر معاملۂ زندگی میں اور ہر گوشۂ عالم میں خالق کائنات اور معبود حقیقی کی مرضی و منشاء کے حصول میں سرگرم عمل رہے۔ اللہ رب العزت سے محبت اور اللہ کے بندوں سے محبت یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد یہی دو امور دین و شریعت کی اصل ہیں جن کی انجام دہی کے بعد ہی وہ انسانیت کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔ ان دونوں حقوق کی ادائیگی سے متعلق مذہب عیسائیت کی تعلیمات ملاحظہ کی جائیں۔ متی کی انجیل میں دین و شریعت کے عظیم ترین

ریڈر، شعبہ دینیات (سنی)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

احکام کی حیثیت سے یہ زریں تعلیمات مرقوم ہیں:

''اور جب فریسیوں نے سنا کہ اس نے صدوقیوں کا منہ بند کردیا تو وہ جمع ہوگئے اوران میں سے ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اس سے پوچھا کہ اے استاد توریت میں کون سا حکم بڑا ہے۔اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ ۔ان ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے''۔(۲)

انجیل کی مذکورہ بالا تعلیمات سے یہ امر تشنۂ توضیح نہیں رہتا کہ انسان کی تخلیق اس دنیا میں محبت کے لیے ہوئی ہے۔ یہ محبت اولاً کائنات کے پیدا کرنے والے سے ہوگی اور ثانیاً اللہ کے بندوں سے ہوگی بلکہ خدا سے محبت کا معیار یہ ہے کہ اس کے بندوں سے محبت کی جائے۔انجیل کی مذکورہ بالا آیتوں میں جو روح کارفرما ہے اس کی وضاحت ایک عیسائی عالم کے ان فقروں سے ہوتی ہے:

''لیکن خدا سے محبت کی مضبوط و مستحکم تعبیر انسانوں سے محبت میں پائی جاتی ہے۔کوئی ایسا شخص خدا سے محبت نہیں کرسکتا جو بنی نوع انسان سے محبت نہیں کرتا۔چنانچہ عیسائی مذہبی عقیدے میں انسانوں کی خدمت ایک مستقل جاری عمل ہے...... دنیا میں بڑے پیمانے پر سماجی عدل وانصاف کو فروغ دینے کے لیے تمامتر کوششیں، ایک نئی انسانیت کی تشکیل و تعمیر کے لیے تمام مصروفیات، انفرادی و اجتماعی مظالم سے نجات یابی کی تمامتر جدوجہد اور انسانی مصروفیات و مشغولیات کی ہر شکل مذہبی قدر و منزلت کی حامل ہے، اگر اس قانون محبت کے ذریعہ اسے تحریک ملتی ہے''۔(۳)

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے نزدیک شریعت کا سب سے بڑا حکم خدا سے محبت رکھنے کے بعد اپنے پڑوسی سے محبت رکھنا ہے۔لیکن وہ صرف محبت کرنے اور غصہ ونفرت نہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ تلقین فرماتے ہیں کہ ایک سچے عیسائی کا یہ شیوہ وشعار ہونا چاہیے کہ ظلم وعدوان اور

بغاوت وسرکشی کے آگے وہ سپر انداز ہو جائے بلکہ شر پسندوں اور فتنہ پروروں کے سامنے اپنے حق سے بھی دست بردار ہو جائے۔ پہاڑی کا وعظ ان کی تعلیم کا گل سر سبد ہے جس پر مسیحی اخلاق و کردار کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اس وعظ میں فرماتے ہیں:

> ''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم شریر کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہیے تو چوغہ بھی اسے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا...... تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو، جو تم پر لعنت کریں، ان کے لیے برکت چاہو، جو تم سے نفرت کریں، ان سے اچھا سلوک کرو، جو تمہیں ذلیل کریں اور تمہیں ستائیں، ان کے لیے دعا مانگو''۔

حضرت عیسیٰؑ اسی وعظ میں فرماتے ہیں:

> ''میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو، جو تم سے عداوت رکھیں ان کا بھلا کرو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لیے برکت چاہو، جو تمہاری بے عزتی کریں ان کے لیے دعا مانگو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا بھی پھیر دے، جو تیرا چوغہ لے اس کو کُرتہ لینے سے بھی منع نہ کر جیسا تم اوروں سے برتاؤ چاہتے ہو تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گناہ گار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں''۔(۴)

حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تعلق سے حضرت عیسیٰؑ مسیح کی تعلیمات اور پہاڑی کے وعظ کے یہ کلمات حسنہ کس حد تک خوشگوار اور دور رس اثرات ونتائج کے حامل ہیں۔ اگر دقت نظری سے جائزہ لیا جائے تو یہ کوئی لاینحل مسئلہ نہیں رہ جاتا، بلاشبہ اسلام میں بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد کا نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نماز، روزہ، حج، قربانی اور تلاوت کلام پاک وغیرہ ایسے امور ہیں

جن کا تعلق خالصتاً اللہ کی ذات سے ہے۔یعنی یہ اگر انجام دیے جارہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی ہورہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ شرک کے علاوہ ایک شخص کی جانب سے حقوق اللہ کی ادائیگی میں دانستہ یا نادانستہ تقصیرات و خطایا پر اللہ رب العزت اپنی شان رحیمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خط عفو پھیر دے لیکن حقوق العباد تلف کرنے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اس کی طرف سے معافی کا پروانہ نہیں ملے گا بلکہ آخرت میں جب میزان عدل قائم ہوگی تو وہ بڑا مفلوک الحال اور قلاش ثابت ہوگا۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بابت بڑا واضح فرمان دیا ہے:

ان المفلس من امتی یاتی یوم القیامة بصلوٰة و صیام و زکوٰة و یاتی قد شتم هذا وقد و هذا واکل مال هذا و سفک دم هذا وضرب هذا فیعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایا هم فطرحت علیه ثم طرح فی النار ۔(۵)	بلاشبہ میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے روز نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کر کے ہوا ہو کہ اس نے کسی پر سب وشتم کیا ہو، کسی پر بہتام تراشی کی تھی ،کسی کا مال کھایا تھا اور کسی کو زدوکوب کیا تھا۔پس ایسے (مظلوم) شخص کو اس (ظالم) کی نیکیوں میں سے بدلہ دیا جائے گا۔ پس اگر ظالم کی نیکیاں مظلومین کو بدلہ چکانے سے پہلے ختم ہوگئیں تو ان (مظلومین) کے گناہوں کا بار (مظالم کے بقدر) ان کے کاندھوں پر ڈال دیا جائے گا پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اسلام کے نزدیک مخلوقات اللہ کے خاندان کے لوگ ہیں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان چاہے جس خطہ ارض کا رہنے والا ہو اور جس رنگ ونسل سے اس کا تعلق ہو، وہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں (۶) ۔اس لیے آپس میں اخوت ومحبت اور ہمدردی وغم گساری کے جذبات کو فروغ و استحکام بخشا جائے ۔ اللہ کے تمام بندوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی جاتی ہے بالخصوص مجبور و پریشان حال بندگان خدا سے اظہار محبت و ہمدردی اور حسن سلوک کو اللہ رب العزت کے ساتھ حسن سلوک قرار دیا جاتا ہے۔حدیث پاک ملاحظہ فرمائیں:

''بلاشبہ قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ (ایک بندے سے) فرمائے گا کہ آدم

کے بیٹے ! میں بیمار تھا اور تو نے میری عیادت نہیں کی تھی، تو بندہ تعجب سے کہے گا کہ اے میرے آقا! میں تیری عیادت کیسے کرتا حالانکہ تو دونوں جہاں کا رب ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی ۔ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے قریب پاتا ۔ اسی طرح ایک بندے سے فرمائے گا کہ آدم کے بیٹے ! میں نے تم سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا ۔ بندہ حیرت سے عرض کرے گا کہ اے میرے آقا! آپ تو ساری دنیا کے پالنہار ہیں، آپ کو میں کیسے کھانا کھلاتا ۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اسے کھانا نہیں دیا ۔ کیا تمھیں معلوم نہیں تھا کہ اگر تو نے اسے کھانا کھلایا ہوتا تو تو نے مجھے اس کے پاس پایا ہوتا ۔ اسی طرح وہ ایک بندے سے فرمائے گا کہ میں پیاسا تھا لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا تھا تو بندہ (حیرت و استعجاب سے) کہے گا کہ اے میرے آقا! آپ تو پوری دنیا کو سیراب کرنے والے ہیں، آپ کو میں کیسے پانی پلاتا ۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا ۔ اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پایا ہوتا“ ۔(۷)

حقوق اللہ اور حقوق العباد سے متعلق انتہائی واضح اور درخشاں تعلیمات اسلام میں موجود ہیں ۔

عاجزی و خاکساری، تذلل و فروتنی، صبر و قناعت، عفو و درگذر، حلم و بردباری، یقیناً یہ اخلاق حسنہ ہیں جن کی فضیلت مسلمہ حقیقت ہے لیکن جب دنیا میں خیر کے ساتھ شر موجود ہے، نیکی کے ساتھ بدی بھی پائی جاتی ہے اور عدل و انصاف کے ساتھ ظلم و جور اور امن و آشتی کے ساتھ فتنہ انگیزی و فتنہ پروری بھی معاشرے کا جزو لاینفک قرار پاتی ہے، ایسی صورت میں نیکی کو یکّہ و تنہا چھوڑ دینا اور اللہ کی دی ہوئی قوتوں اور اسباب و وسائل کو اس کی بقا و حفاظت کے لیے استعمال نہ کرنا یہ بالواسطہ بدی کی طاقت کو پروان چڑھانے اور فتنہ و شر کی امداد ہے ۔ ایک گال پر طمانچہ کھانے کے بعد دوسرا گال اس کے لیے پیش کر دیا جانا بظاہر خیر و صلاح اور برّ و تقوی کا مظہر ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ عمداً ظالموں کو موقع دیا جائے اور مفسدوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، یہ

پرلے درجے کی بزدلی ہے جس کی بنیاد پر دنیا امن وآشتی کا گہوارہ بننے کے بجائے شر وفساد اور بدامنی وتشدد کی آماج گاہ بن جاتی ہے۔انسانیت کی خیر وفلاح کی خاطر خدا کی زمین پر امن وآشتی کا قیام واستحکام ہی دراصل انسانیت کی عظیم الشان خدمت اور اس سے محبت کا اعلیٰ مظہر ہے۔اس باب میں قرآن مجید تمام فرزندان اسلام کو دنیا کا جیدہ گروہ قرار دیتے ہوئے فلاح انسانیت پر اپنی توجہات مرکوز کرنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ ذہن نشیں کراتا ہے کہ انسانیت کی خدمت کے اس عظیم اور مقدس مقصد کی یافت معروفات کی تبلیغ وتلقین اور منکرات کی بیخ کنی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔(۸)	تم لوگ ایک بہترین امت ہو جسے انسانیت کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔

خیرات وحسنات کو منکرات وسیّات کا قلع قمع کر کے انسانیت کو امن وراحت کی نعمت سے ہمکنار کرنا بلاشبہ بڑا ہی مبارک ومستحسن فریضہ ہے۔اگر معاشرے کی برائیاں عفو ودرگذر،صبر وتحمل اور تذلل وفروتنی سے معدوم ہوجاتی ہوں تو بلاشبہ یہ دلنشیں اور موثر حربہ ہیں۔اسلام میں برائی کو اچھائی سے بدلنے کا یہ اقدام ایک بڑی پرحکمت تدبیر (Strategy) قرار دی جاتی ہے جسے اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ۔(۹)

اس کے برعکس اگر بدی پر ان اخلاق فاضلہ کے ذریعہ قابو نہیں پایا جاتا تو عیسائیت کی طرح عزلت نشیں اور کنارہ کش ہونے کی تعلیم اسلام میں نہیں دی جاتی بلکہ یہ میدان کارزار میں سرگرم عمل ہونے کی تلقین کرتا ہے اور اس کے انسداد کی کوششوں کو تقاضہ ایمان قرار دیتا ہے۔اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۔(۱۰)	اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی کذب و بطلان اور شر و فساد کے خلاف اقدامی عمل کی دعوت دیتا ہے:

من رای منکم منکرا فلیغیر بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان ۔(۱۱)

تم میں سے کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ اسے طاقت کے زور سے مٹا دے، اگر وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا ہے تو اسے اپنی زبان سے مٹا دے ۔ وہ اگر اسے زبان سے بھی روکنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے تو اسے اپنے دل سے مٹا دے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

حدیث مذکور میں ایمان کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں ۔ ایمان ہر حال میں بدی کے خلاف حرکت کا نام ہے ۔ اگر عفو و درگذر اور حلم و بردباری کے ذریعہ شر انگیزی و فتنہ پروری پر قابو نہیں پایا جا رہا ہو تو اسے روکنے کے لیے حتی المقدور وسائل کا استعمال دراصل محبت انسانیت اور تقاضہ ایمان ہے ۔ ایمان کا کمزور ترین درجہ دل سے روکنے کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی اور برائی کے ارتکاب کرنے کے سلسلے میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ غم و غصہ اور نفرت کا مظاہرہ ہونا چاہیے ۔ یہاں تک کہ اضطراب و بے چینی کا یہ عالم ہو کہ معمولات و مصروفیات میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوں ۔ یہاں اگر محبت کی قوتیں استیصال شر میں کارگر نہ ہو سکیں تو ان اسباب و وسائل کو بروئے کار لانا چاہیے جو اس سلسلے میں کامیابی سے ہمکنار کر دیں ۔ برائیوں کو دیکھ کر اضطراب و بے چینی اور اچھائیوں کو دیکھ کر راحت و سرور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول ایمان کے مظاہر ہیں ۔ اسی کو احادیث نبویہ میں اللہ کی خاطر دوستی اور اللہ کی خاطر دشمنی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ایسا مبارک عمل ہے جو قیامت کے روز ظل الٰہی کی سعادت سے شرفیاب ہونے کا ضامن قرار پاتا ہے (۱۲) ۔ یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ اسلام اس مرحلے میں بھی جب کہ ظالم سے نبرد آزمائی کی تلقین کرتا ہے، اس کی خیر خواہی کا علم بھی اپنے ہاتھوں میں اٹھاتا ہے ۔ اسلام دراصل فتنہ پرور، ظالم اور باغی سے نہیں بلکہ وہ فتنہ پروری، ظلم، بدی اور بغاوت سے نفرت کرتا ہے اور اگر وہ برائی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور اس کے انسداد کے لیے عملی اقدامات کی تعلیم و

تلقین کرتا ہے تو اس میں بھی پورے معاشرے کی خیر و فلاح کے علاوہ اس ظالم و فتنہ پرور کے حق میں ہمدردی و محبت اور کامیابی و کامرانی کا فلسفہ مضمر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بدی کا مرتکب اور ظلم و عدوان کا علم بردار اگر اپنے اعمال شنیعہ اور حرکات ذمیمہ سے معاشرہ انسانی کے امن و آشتی کو درہم برہم کرتا ہے، وہیں وہ اپنے قلب و ضمیر کے امن و آشتی کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے اور آخرت کے بازار میں اس کی یہ حرکتیں کھوٹا سکّہ بلکہ افلاس و محرومی کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں یہی فکر و فلسفہ ناطق ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

انصر اخاک ظالما او مظلوما ، یا	تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابی
رسول اللہ ھذا ننصرہ مظلوما	رسولؐ نے عرض کیا ہم مظلوم کی مدد کریں (یہ بات
فکیف ننصرہ ظالما قال تاخذ	سمجھ میں آتی ہے) لیکن ہم ظالم کی مدد کیسے کریں۔
فوق یدیہ ۔(۱۳)	آپؐ نے فرمایا اس کے ظلم کے ہاتھوں کو مروڑ دو۔

مسیحیت کا نظریہ یہ ہے کہ دین کا اصل الاصول محبت ہے اس کے علاوہ تمام انسانی خصائل اور فطری جذبات باطل اور باطل ہیں جن کی بیخ کنی کے ذریعہ دین داری یا راست بازی کی افزائش ہوسکتی ہے۔ اس نظریہ کے علم برداروں کی نگاہ اس حقیقت کے ادراک سے دور ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز عبث نہیں ہے (۱۴)۔ حالانکہ غضب، غصہ، حب نفس، شہوت، شجاعت و خودداری، جرأت و بہادری، عزم و استقلال، عدل و انصاف یہ سب چیزیں انسانیت کے لوازم و مقتضیات ہیں۔ یہ سب عواطف و جذبات اپنے اپنے موقع و محل میں شایان انسانیت فرایض انجام دیتے ہیں اور یہ سب اوصاف ایک نظم و ضبط کے پابند ہوکر اعتدال اور میانہ روی کی روح سے متصف ہوں تو حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اوصاف موقع و مناسبت کے لحاظ سے ایک نمونے کے انسانی معاشرہ کے قیام و استحکام کے نئے عوامل و اسباب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ انسانی جذبات اور اخلاقی خصائص اگر بے لگام ہوکر افراط و تفریط کا شکار ہوجائیں تو یہ سب کسی سماج کے لیے ناسور بن جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ایک مایہ ناز دانشور اور مفسر قرآن کی عیسائیت کے پس منظر میں یہ وضاحت معنی خیز ہے:

''شجاعت اگر حد سے بڑھ جائے تو تہوّر اور حماقت کے درجہ تک پہنچ

جاتی ہے۔ دوراندیشی اگر افراط کا پہلو اختیار کر لے تو بزدلی اور نامردی بن جاتی ہے۔ رحم اگر اپنی قدرتی حدود میں نہ رہے تو جرائم و معاصی کا مددگار بن جاتا ہے۔ فیاضی اگر حد سے گزر جائے تو اسراف و تبذیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کفایت شعاری اگر زیادہ ہو جائے تو بخل اور کنجوسی سے بدل جاتی ہے، محبت اگر اپنی حدود میں نہ رہے تو انسان کی عقل کو اندھا کر دیتی ہے، مروت اگر بے موقع استعمال کی جائے تو بدکاریوں میں جسارت اور بے باکی پیدا کر دیتی ہے۔ حلم و بردباری اگر بے محل ہو تو گستاخی اور ظلم کی محرک بن جاتی ہے، فروتنی اور انکساری اگر بے جا ہو تو خودداری اور عزت نفس خاک میں مل جاتی ہے۔ غرض یہ کہ نفس انسانی کو جتنی قوتیں عطا کی گئی ہیں سب اپنے اچھے اور برے دونوں پہلو رکھتی ہیں...... جس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے لیے صرف ہاتھ پاؤں اور قلب و دماغ ہی مفید ہیں، آنکھ، ناک، معدہ و جگر وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے، قوت سامعہ اور لامسہ کافی ہے، باصرہ اور شامّہ کی ضرورت نہیں ہے، محض شعور و ادراک کفایت کرتا ہے، حافظہ اور تمیز کی ضرورت نہیں ہے، بالکل اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان میں صرف محبت و رحم، عفو و درگزر، عجز و فروتنی ہی کی ضرورت ہے، نفرت و غضب، شجاعت و مردانگی، خودداری و عزت نفس اور غیرت و حمیت وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے''۔(۱۵)

یہ دنیا دارالعمل یا دارالامتحان ہے۔ یہاں کی ساری چیزیں اصل امتحان دہندہ انسان کے لیے امتحان کی تیاری کے لوازم و مقتضیات اور اسباب و عوامل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دنیوی اسباب و وسائل سے احتراز و اجتناب خود اپنے اوپر ظلم ہے۔ اس لیے کہ اس طریقۂ عمل سے ایک شخص اپنے آپ کو ان جائز لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر لیتا ہے جو اللہ رب العزت نے اس کے لیے پیدا کی ہیں اور جو اخروی فلاح و کامرانی کے لیے توشۂ راہ کے طور پر خدا نے مہیا کی ہیں۔ اس طرح دنیا اور اسباب دنیا کو صحیح طور پر نہ برتتے ہوئے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے فریضے کی کما حقہ انجام دہی بھی اس کے لیے ناممکن ہو جاتی ہے جس کی بنا پر ابدی سعادت و کامرانی سے محرومی بھی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ مسیحی مذہب جس شکل میں ہم تک پہنچا ہے اس کی تعلیمات

پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ہی یہ مترشح ہوتا ہے کہ تیاگ، رہبانیت اور سنّیاس اس مذہب کے خاصہ اور وطیرہ ہیں۔ اس کی ساری توجہات کا مرکز صرف ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ انسان کس طرح آسمانی بادشاہت میں داخل ہو جائے۔ یہی ایک سوال تمام مسیحی اخلاقیات کا مرکز و محور ہے اور جو کچھ حضرت عیسیٰؑ مسیح نے تعلیم دی ہے اس کا مقصد اسی نصب العین کے حصول کے لیے انسانی جماعت کو تیار کرنا ہے۔(۱۶)

آسمانی بادشاہت مسیحیت کے نقطۂ نظر سے ارتقائی منزل کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے متصادم و متضاد ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضد ماننے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس فکر کے علم برداروں کے نزدیک جو چیزیں زمینی بادشاہت و حکومت کے ساز و سامان میں داخل ہیں وہ آسمانی حکمرانی و بادشاہت کی نقیض بلکہ مانع و مزاحم ہیں اس لیے مسیحیت اس فکر کی نقیب و ترجمان ہے، زمینی حکمرانی و بادشاہت کے تمام اسباب و وسائل سے کلی اجتناب کے بعد ہی آسمانی بادشاہت میں شمولیت کی امید حقیقت میں بدل سکتی ہے۔ متی کی انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب تعلیم یوں مرقوم ہے:

> ''اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال اسباب بیچ کر غریبوں کو دے دے اور میرے پیچھے ہو لے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا''۔(۱۷)

لوقا کی انجیل میں حضرت مسیحؑ کا یہ فرمان موجود ہے:

> ''اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور اولاد اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا''۔(۱۸)

متی کی انجیل میں ایک جگہ وضاحت سے مذکور ہے:

> ''میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کی فکر کرو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ یا کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں ہے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو نہ بولتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے ...... جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کیسے بڑھتے ہیں، نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاٹتے

ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی اپنی ساری شان وشوکت کے باوجود
ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی
گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے
کم اعتقادو! تم کو وہ ضرور ہی پہنا دے گا۔ اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا
کھائیں گے؟ کیا پہنیں گے؟''۔(۱۹)

مذہب اسلام میں دنیا اور اسباب دنیا نہ شجر ممنوع کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ہی متاع محبوب ومقصود جسے بے خوف وخطر تمام حدود وقیود کو پامال کر کے اپنانے کی جدوجہد کرنی چاہیے، بلاشبہ اصل منزل آخرت کی منزل ہے جس کی اصل فکرمندی کی جگہ جگہ قرآن وسنت میں تلقین کی گئی ہے(۲۰) اور یہی زندگی دراصل لافانی ولازوال ہے(۲۱)۔ ہاں چونکہ اس دنیا کو امتحان گاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے خیر وفلاح کا علم بردار اور کامیابی وکامرانی کے خوگر وخواہاں کے لیے اسے نظر انداز کرنا نہ یہ کہ صرف مناسب نہیں ہے بلکہ اپنے امتحان دہندہ کی حیثیت کو فراموش کر کے محرومی وبدبختی سے دوچار کرنے کے مترادف ہے۔ رسول مقبولؐ کے اس مقدس فرمان کی روشنی میں دنیا آخرت کی کھیتی ہے(۲۲)۔ چنانچہ خوشگوار اور شیریں ثمرات ونتائج کی توقع کاشت کیے بغیر ایک گونگے کے خواب اور ایک دیوانے کی بڑ علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی طرح رسالت مآبؐ کے ایک فرمان کے مطابق دنیا کا ہر فرد ایک مسافر ہے اس کی اصل منزل آخرت ہے(۲۳)۔ منزل مقصود کی طلب وجستجو کا شوق نہ آلام ومصائب سے ایک مسافر کو بددل اور پست حوصلہ کرتا ہے اور نہ ہی حسین ودلکش اور جاذب نظر اشیاء اسے مسحور کرتے ہوئے منزل کے حصول میں مانع و مزاحم بنتی ہیں۔ ایک حازم ومحتاط مسافر جو منزل کا طالب ومشتاق ہو سفر سے گریز وفرار اختیار نہیں کرتا ہے بلکہ وقتی مصائب ومشکلات کو سر کرتے ہوئے اور زوال آشنا اور فانی راحت وآسائش سے متمتع ہوتے ہوئے سفر کے اصول وضوابط کا پابند ہو کر کشاں کشاں منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بعینہٖ آخرت کا مسافر نہ تو دنیا و مافیہا کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ ہی حزن وغم اور رنگینی و دلفریبی کے وقتی مناظر ومظاہر مسافر آخرت کے پایۂ استقامت میں پیدا کرتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک دنیا کے مال ومتاع اور اسباب وعوامل سامان آزمائش ہیں(۲۴)۔

اگر یہ جائز طریقے سے حاصل کیے جائیں اور جائز مصارف میں استعمال کیے جائیں تو نوازش خداوندی ہے جس کے حصول کے لیے بندۂ خدا شب و روز کے متعدد اوقات میں بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوتا ہے(۲۵)۔بصورت دیگر یہ فتنہ اور ہلاکت و بربادی کے سامان ہیں(۲۶)۔اس کے برخلاف مسیحیت روحانی ترقی اور آسمانی حکمرانی و بادشاہت کے لیے دنیا اور اسباب دنیا سے فرار و گریز کی دعوت دیتی ہے۔دنیا میں نظام امن و عدل کا قیام صبر و تحمل، عاجزی و فروتنی، عفو و درگذر اور حلم و بردباری کے ساتھ ہی ساتھ سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کے قانون پر مبنی ہے لیکن مسیحیت اس فکر کی قائل بلکہ علم بردار ہے کہ جب تک مکافات عمل کی قانونی دفعات کو بالائے طاق نہ رکھ دیا جائے آسمانی باپ کے نزدیک قصوروں کی معافی ممکن نہیں۔حضرت مسیح کی تعلیم کو خود مسیحی علماء و دانشور جس رنگ میں پیش کرتے ہیں چالیس سے زیادہ علماء مسیحیت کی مدد سے ریورینڈ ڈومیلو کے ذریعہ تیار کردہ تفسیر انجیل کے ذریعہ اس کی ترجمانی ہوتی ہے۔جس میں انجیل کا یہ عالم رقم طراز ہے:

> ''مسیح نے انسانی سیرت کے لیے وہ طرز پسند کیا ہے جو بڑی حد تک دنیا کے پسند کیے ہوئے طرز سے مختلف ہے۔خود دلیری کی بجائے فروتنی اپنے حقوق پر جمے رہنے کی بجائے بدی کے آگے سر جھکا دینا اور وسعت طلبی کی جگہ قناعت، شرافت، عجز و صبر، ہمدردی، مصیبت میں خوش ہونا، درد سے راحت حاصل کرنا، یہ دنیا کو مسیحیت کے عطایا ہیں......مگر ایک مسیحی کے کیریکٹر کی سب سے زیادہ جامع تعریف غالباً یہ ہے کہ وہ ایک یکسو آدمی ہوتا ہے۔وہ ایک پاؤں دنیا میں اور دوسرا دین (چرچ) میں نہیں رکھ سکتا۔وہ ایک ہی وقت میں خدا اور متاع دنیا دونوں کی خدمت نہیں کرسکتا......مسیح کے نزدیک دنیا کے پاس انسان کو اپنی خدمت پر مجبور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دولت ہے، لہٰذا ایک مسیحی بننے کے لیے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ انسان دولت سے بے تعلق ہوجائے''۔(۲۷)

عصر حاضر کا انسان تمام تر مادی آسائشوں اور خوش حالیوں کے باوجود امن و عدل کی نعمت عظمیٰ سے محروم ہے۔چاہے یہ امن و آشتی ضمیر و عقیدہ کی ہو یا پھر سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی مشاغل و مصروفیات اور امور و معاملات میں ہو۔اس انتشار و بدامنی اور بدعنوانی و فتنہ پروری

کی بنیادی وجہ ہے۔فرد اور معاشرے کی زندگی پر انسان کے خود ساختہ قانون کا تسلط۔اگر اس خدائی ضابطۂ زندگی کی بالادستی زندگیوں پر جاری وساری اور قائم ودائم ہوجائے جس میں نقص وکوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جو تعصب و مفادات سے پرے ہوکر دوام واستحکام کے ساتھ پوری انسانیت کے خیر وفلاح کا ضامن ہوتا ہے تو بلاشبہ جس طرح عالم سماوات تکوینی طور پر خدائی ضابطے سے منسلک ہوتے ہوئے توافق وہم آہنگی کے دلکش نظارے پیش کررہا ہے۔اسی طرح عالم ارضی بھی خدائی ضابطے کا پابند ہوکر انسانیت کو سعادت وکامرانی کی ضمانت دے سکتا ہے۔عیسائیت نے محبت انسانی کو مرکزی حیثیت دے کر اور اسباب دنیا کو آسمانی بادشاہت کا نقیض بلکہ متضاد و متصادم قرار دے کر امن وعدل کے قیام کی دہائی دی ہے لیکن صداقت یوں نظر آتی ہے کہ اپنے مخصوص افکار وعقائد کے حصار میں رہتے ہوئے۔عیسائیت انسانی جذبات واحساسات کو بہ نظر حقارت دیکھتی ہے اور اپنے علم برداروں کو کذب وفریب اور بدی وبغاوت سے نبرد آزمائی کا سبق دینے کی بجائے سپر انداز ہونے کی تلقین کرتی ہے۔اسی طرح روحانیت کی افزائش اور آسمانی حکمرانی وبادشاہت میں شمولیت کے لیے اسباب دنیا سے تعلق کو زبردست مانع ومزاحم قرار دے کر انسانیت کو اس کے شرف وعظمت کی عملی تفسیر بننے سے روک دیتی ہے۔اس کے برعکس اسلامی تعلیمات اپنے ماننے والوں کو صحیح طور پر بشر دوستی اور انسانیت نوازی کا نقیب وعلم بردار بناتے ہوئے ظلم وعدوان، بغاوت وسرکشی اور تمام ستم کے منکرات وسیّات کا قلع قمع کرنے کی تلقین کرتی ہے تاکہ زمین پر امن وعدل کا بول بالا ہو۔اسی طرح دنیا اور اسباب دنیا سے متعلق یہ تعلیمات معتدل نقطۂ نظر کا حامل بناتے ہوئے اپنے ماننے والوں کو حیات ابدی کی مسرت جاودانی کے حصول کا اس طرح خوگر بنادیتی ہیں کہ ایک طرف اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا مقام مجروح نہیں ہوتا اور دوسری طرف ان کا وجود بنی نوع انسان کے لیے سراپا رحم وکرم اور امن وعدل بن جاتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) التین:۴۔(۲) انجیل متی باب ۲۲ آیت ۳۵-۴۰۔

(۳) G. Gipperi- Sauen, SJ: Christianity see the Religions of India Forward

by Dr. Karan Singh, India Library, P

(۴) انجیل متی باب ۵ آیت ۳۸-۴۴ اور انجیل لوقا باب ۶ آیت ۲۷-۳۳۔ (۵) مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح، ج ۱۶، کتاب البر، ص ۱۳۴-۱۳۵، بیروت۔ (۶) النساء: ۱۔ (۷) القشیری: الجامع الصحیح، ج ۱، کتاب البر، ص ۱۲۵-۱۲۶، بیروت۔ (۸) آل عمران: ۱۱۰۔ (۹) فصلت: ۳۴۔ (۱۰) الشوریٰ: ۳۹۔ (۱۱) ابو عبداللہ محمد ابن اسماعیل البخاری: الجامع الصحیح، ج ۱، کتاب الاذان، ص ۹۱۔ (۱۲) البخاری: ، ج ۱ کتاب المظالم والقصاص، ص ۳۳۱۔ (۱۳) ص ۲۷۔ (۱۴) سید ابوالاعلیٰ مودودی: یہودیت و نصرانیت، مرتب: نعیم صدیقی، ص ۳۵۷-۳۵۸، طبع اول، جنوری ۱۹۸۳ء، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی۔ (۱۵) ایضاً، ص ص ۳۴۷۔ (۱۶) انجیل متی باب ۱۹ آیت ۲۱۔ (۱۷) انجیل متی باب ۱۹ آیت ۲۱۔ (۱۸) انجیل لوقا باب ۱۴، آیت ۲۶۔ (۱۹) انجیل متی باب ۶ آیت ۲۵-۳۱۔ (۲۰) الحشر: ۱۸۔ (۲۱) العنکبوت: ۶۴، الاعلیٰ: ۱۷۔ (۲۲) الملک: ۲۔ (۲۳) ابوعبداللہ احمد بن محمد ابن حنبل: المسند، ج ۲، ص ۲۴۔ (۲۴) ایضاً۔ (۲۵) التغابن: ۱۵۔ (۲۶) البقرہ: ۲۰۱۔ (۲۷) المنافقون: ۹۔ (۲۸) Revrend Dumellew: Commentery on the holy Bibli, p.80، بحوالہ یہودیت و نصرانیت، ص ۳۵۰۔

دارالمصنّفین کا سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

اخبار علمیہ

''معرض ''محمد رسول اللہؐ'' کا افتتاح''

مدینہ منورہ کو اسلامی تہذیب و ثقافت کے دارالخلافہ کے طور پر منتخب کرلیا گیا ہے، اسی حیثیت کے مدنظر وہاں ''محمد رسول اللہؐ'' کے عنوان سے ایک مستقل نمائش گاہ قائم کی گئی ہے، جس کا افتتاح امیر فیصل بن سلیمان بن عبدالعزیز نے کیا۔ یہ میوزیم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور تعلیمات و ہدایات پر اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ حیات طیبہؐ گویا مجسم شکل میں سامنے آجاتی ہے، اس میں جدید ٹکنالوجی کا بھی بڑا دلآویز استعمال کیا گیا ہے۔ یہ میوزیم دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں آپؐ کے سوانح حیات کے ان پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے جن سے آپؐ کی عظمت، فضیلت اور آپؐ کے مقام و مرتبہ کا نقش نظر سے دل کی گہرائیوں میں ثبت ہوجائے، آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ پر مشتمل نہایت دیدہ زیب طغرے تیار کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں عہد مکی و مدنی کے واقعات سیرت، حسب و نسب اور آپؐ کی عائلی زندگی سے متعلق طغرے اور تختیاں ہیں، کچھ ایسی تختیاں بھی ہیں جن سے مسجد نبویؐ کی تاسیس سے دور حاضر تک کے عہد بہ عہد تعمیراتی مراحل کی تاریخ محسوس انداز میں سامنے آجاتی ہے، یہی نہیں عہد نبویؐ کی تعمیرات کے مرقعے بھی ہیں جن کو دیکھ کر دیکھنے والا خود کو اسی ماحول میں موجود پاتا ہے۔ (العربیہ نٹ، الفن والثقافۃ، ۱۳/ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

''پیروں سے کنٹرول والی کار کی ایجاد''

امارات یونیورسٹی کے شعبۂ انجینئرنگ کی ایک طالبہ حریم المرزوقی نے اعلیٰ تعلیم امریکہ میں حاصل کی، اس ذہین طالبہ نے پیروں سے چلائی جانے والی ایسی کار ایجاد کی ہے جس کو امریکہ کے پینٹ آفس کی جانب سے عمدہ ترین اور دنیا کی پہلی ''پیروں سے چلنے والی کار'' قرار دیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس نے یہ کارنامہ امریکہ کے اختراعی و تکنیکی فاؤنڈیشن کے تعاون سے انجام دیا ہے، گذشتہ دنوں دبئی میں اس کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا، حریم مرزوقی کے اساتذہ نے کہا کہ یہ ایجاد ہمارے لیے باعث فخر اور تمام مسلمان طلبہ کے لیے قابل تقلید ہے۔

حریم نے کہا کہ بچپن سے ہی میں نے سوچ رکھا تھا کہ مجھے ایسی چیز بنانا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ بنائی ہو، اس کار کے بنانے کا محرک دونوں ہاتھوں سے محروم امریکہ کی ایک خاتون پائلٹ کے جہاز اڑانے کا کارنامہ ہے۔ یہ خیال اس کارنامہ سے آیا کہ ایسی کار تیار کی جائے جو بے دست لوگ چلا سکیں، اس منصوبہ پر ایک سال صرف ہوا، رپورٹ کے مطابق پیروں کے رکھنے کی جگہ ایک (خودکار) بورڈ نصب کیا گیا ہے جس میں بریک، گیئر اور اسٹیرنگ سمیت گاڑی کو قابو میں رکھنے کا پورا نظام موجود ہے، امارات میں جلد ہی اس قسم کے معذور لوگوں کے لیے یہ کار دستیاب ہوگی۔ اس کامیاب ایجاد کے بعد حریم المرزوقی نے صرف دماغ کے اشارے سے چلنے والی کار بنانے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ (تفصیلی رپورٹ، منصف حیدرآباد، یکم نومبر ۲۰۱۳ء میں دیکھی جا سکتی ہے)

''مصحف قدیم کی دریافت''

ترکی کے شہر بودروم کی ایک مسجد کے امام کو قرآن مجید کا ایک نسخہ ملا ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بارہ سو سال قدیم ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر قرآن پر مشتمل متعدد مخطوطات بھی ملے ہیں۔ فی الحال مصحف و مخطوطات کی عمر کے باقاعدہ تعین کے لیے ایک تحقیقاتی ٹیم کو ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۱)

حضرت مجدد الف ثانیؒ پر عالمی سمپوزیم''

۱۵؍ تا ۱۷؍ اکتوبر ۲۰۱۳ء میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی حیات و خدمات پر ایک عالمی سمپوزیم استنبول میں منعقد ہوا۔ اس میں ۳۰؍ ملکی اور ۱۰؍ بیرون ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ سمپوزیم میں پیش کیے گئے مجموعۂ مقالات جلد ہی شائع کیے جائیں گے اور امید ہے یہ مجموعہ امام ربانی کی شخصیت اور کارناموں پر ایک دستاویز ہوگا۔ سمپوزیم میں کل نو نشستیں ہوئیں۔ امام ربانی حیات اور عہد، خدمات، مذہبی، صوفیانہ اور عالمانہ افکار و نظریات، اناطولیہ اور اناطولیہ سے باہر مجددی اثرات جیسے عناوین کے تحت مقالات کے سات سیشن ہوئے،، جن میں قرآن و سنت کے مطابق امام ربانی کی زندگی اور مکتوبات امام ربانی مع حواشی و تعلیقات شائع کرنے پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود سے متعلق امام ربانی کے نظریات پر

زوردار بحث ہوئی تھی ۔ ایک نشست میں متکلمانہ مسائل اور رخصت وغیرہ موضوع بحث تھے، اکبر کے دین الٰہی کے فروغ کے خلاف امام ربانی کی خدمات کا جائزہ لیا گیا کہ امام ربانی کی وجہ سے ہی اکبر کی یہ تحریک نتیجہ کے لحاظ سے صفر بلکہ بے اثر رہی ۔ آج مغربی فلاسفہ و مفکرین عقلیت، انسانیت اور تانیثیت کے نام پر مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات کی اصل روح اور حقیقی معانی و مفاہیم سے دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، ایسے حالات میں امام ربانی کے صوفیانہ نظریات اور ان کی روحانی تعلیمات بڑی اہم اور قابل قدر ہیں اور عالم اسلام میں قیام امن اور احیائے دین میں ان کے افکار سے بڑی مدد لی جاسکتی ہے ۔ ترکی کے علاوہ ازبکستان، اٹلی، نیوزی لینڈ، ہندوستان اور پاکستان کے فضلاء اس میں شریک ہوئے ۔ پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر پرویز غلام معین الدین، ڈاکٹر محمد اقبال مجددی پاکستان سے اور ہندوستان سے ڈاکٹر عطا خورشید نے اس عالمی سمپوزیم میں شرکت کی ۔ (یہ اطلاع ڈاکٹر عطا خورشید، لائبریرین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے معارف کو فراہم کی)

''روس میں اسلامی ٹی وی چینل کا آغاز''

روسی مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں کے درمیان باہم روابط کو مستحکم بنانے کے لیے روس میں ایک اسلامی ٹی وی چینل کا آغاز کیا گیا ہے ۔ فی الحال اسے انٹرنیٹ پر دیکھا جاسکتا ہے ۔ اس کے ڈائریکٹر رستم عارف جانوف کے بیان کے مطابق آیندہ سال اس کو باقاعدہ عام ٹی وی چینلوں پر دیکھا جاسکے گا، جن میں قرآن مجید اور احادیث پر مشتمل پروگراموں کو خاص طور پر نشر کیا جائے گا اور مسلمانوں کے مسائل پر غور کرنے اور ان کے حل کی تلاش کے لیے عالم اسلام کی نامور شخصیتوں سے بھی یہ ٹی وی ادارہ رابطہ قائم کرے گا ۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، اکتوبر ۲۰۱۳ء)

ک ، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے چند اہم ہندوستانی قلمی سفر نامے

۶۹ ماڈل ٹاون، ہمک،
اسلام آباد (پاکستان)

معارف نومبر ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن صاحب کا مضمون ''بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے چند اہم ہندوستانی قلمی سفر نامے'' پڑھا۔ یہ مضمون بقول ان کے تین ایسے سفر ناموں کے تعارف پر مبنی ہے جو تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ فاضل مضمون نگار کی نظر سے کچھ حقائق یا معلومات اوجھل رہے ہیں۔ ان کا بطور استدراک ذکر ضروری ہے۔

۱- بیان واقع از خواجہ عبدالکریم، ڈاکٹر کے بی نسیم نے مرتب کیا تھا اور اسے ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

۲- زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار پر اس سے پہلے بھی تعارفی مقالات چھپ چکے ہیں، جیسا کہ:

الف: شریف حسین قاسمی، ''دریچہ ای بہ شیراز قرن نوزدہم میلادی''، سہ ماہی دانش، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، شمارہ ۱، ص ۸۸-۱۰۱

ب: شریف حسین قاسمی، ''زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار''، آشنا، تہران، سال ۴، شمارہ ۲۴ (۱۹۹۵ء)

ج: سید حسن عباس، ''زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار (محیط ثالث) کا نادر مخطوطہ''، ادراک، گوپال پور، شمارہ ۴، ۲۰۰۴ء، ص ۶۱-۶۸

عارف نوشاہی

دارالمصنّفین اور مولانا مودودیؒ

یوسف گوڑہ، چیک پوسٹ،
حیدرآباد
۲۰۱۳/۱۱/۱۹ء

مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف'' پابندی سے مل رہا ہے۔ شکریہ، اکتوبر ۲۰۱۳ء کے معارف میں پروفیسر شکیل اوج صاحب کا مضمون ''شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قرآن فہمی'' قابل داد اور قابل یاد مضمون ہے قرآنیات میرا موضوع ہے بلکہ جینے کا مقصد وحید ہی خدمت قرآن ہے۔

معارف اور مولانا مودودیؒ میں ایک معروف مناسبت ہے۔ مولانا مودودیؒ کی معرکۃ الآراء کتاب جس نے مولانا مودودیؒ کو عالم سے علامہ اور محقق بنایا اور ان کی زندگی کو بامقصد بنانے میں بنیادی رول ادا کیا وہ ''الجہاد فی الاسلام'' ہے۔ مولانا مودودیؒ کے مضامین الجمیعۃ دہلی میں ۲؍فروری ۱۹۲۷ء سے ''اسلام کا قانون جنگ'' کے عنوان سے چھپے تھے ''دارالمصنّفین، اعظم گڑھ نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کتابی شکل میں الجہاد فی الاسلام کے نام سے ۱۹۲۸ء میں شائع کردیا۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں شدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کی نفرت انگیز تحریک وتحریر کا بھرپور اور مدلل جواب دینے کی ضرورت اور جہاد کی حقیقت سے ملت کو اور مخالفین کو قرآن، اسلام اور سیرت سرور کائناتؐ کی اصل تعلیمات سے واقف کرانے کے مقصد سے انہوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت عالمی جنگ اور صلیبی اور یہودی سازشیں بھی اس کتاب کی تالیف کا محرک تھیں۔ یہ بات بھی ہے کہ مولانا مودودیؒ نے مولانا محمد علی جوہر کی جامع مسجد کی تقریر اور اپیل سے متاثر ہوکر یہ موضوع اختیار کیا گو مولانا مودودیؒ اس وقت صرف ۲۳؍سال کے نوجوان تھے اور الجمیعۃ کے ایڈیٹر بھی تھے مگر اعلیٰ علمی حلقہ میں ابوالاعلیٰ کو متعارف کرانے میں ''معارف'' نے قابل قدر اور ناقابل فراموش رول ادا کیا ہے اور مجھے معارف سے اسی لیے محبت ہے۔

کتاب ''مقصد تخلیق انسان موجبات فلاح وموجبات خسران'' آپ کے ادارہ کے لیے (۴۰) کاپیاں تحفتاً بھجوایا تھا۔ جولائی ۲۰۱۳ء سے اکتوبر ۲۰۱۳ء ''چار ماہ کا چلّہ'' مکمل کرلینے کے باوجود آپ تک نہیں پہنچ پائی ہے۔

احقر احمد سعید

مطبوعات جدیدہ

عرب و ہند کی علمی و ادبی خدمات: از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۰۰، قیمت: ۱۴۱ روپے، پتہ: مرکز تحقیقات اسلامی، گلشن عتیق، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی و بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴۔

عربی لغت نویسی، جدید عربی شاعری، مصر کی ناول نگاری اور محمد حسین ہیکل کے عنوانوں کے تحت عربوں اور باقی نو مضامین میں بعض ہندوستانی اہل قلم کی علمی و ادبی خدمات پر سیمناری مقالوں کے اس مجموعہ میں مخطوطہ شناسی، ترجمے کی ضرورت اور ہندوستان میں عربی ادبی نگارشات کی تدوین و تحقیق کا ایک جائزہ بھی شامل ہے۔ سیمناری مقالات کی وجہ سے بظاہر ترتیب و تنسیق کی کمی نظر آتی ہے لیکن موضوعات کے تنوع اور معلومات کی کثرت سے یہ کتاب بڑی مفید اور کارآمد ہوگئی ہے۔ فاضل مصنف عرصہ تک خدابخش لائبریری کے شعبہ تحقیق سے وابستہ رہے اور ذہن و مزاج و مذاق علمی کے لحاظ سے وہ بامقصد اور افادی ادب سے پیوستہ رہے،، رابطہ ادب اسلامی کے وہ باقاعدہ رکن ہیں، ملک کی مختلف جامعات اور اداروں میں وہ اپنے نظریات ورجحانات پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریر کی بڑی خوبی اسلوب کی سادگی اور فکر کی پاکیزگی ہے اور زیر نظر منتخب مجموعہ مقالات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، ہیکل اور پریم چند کا موازنہ، وسعت نظر کا نتیجہ ہے تو مخطوطات کی روشنی میں عربی ادبیات ہند ان کی محنت و جستجو کا آئینہ ہے، جدید عربی شاعری میں ایمان کی بہار سے ذوق سلیم کا اندازہ ہوتا ہے جس میں انہوں نے مغرب زدہ جدید عربی شاعروں کے متعلق درست لکھا کہ یہ احساس کمتری کے شکار اور اپنے علمی و ادبی ورثہ پر فخر کرنے کی بجائے شرمندہ ہی نظر نہیں آتے بلکہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی اظہار میں یقیناً اردو کی ادبی صورت حال ان کے پیش نظر ہے۔ خدابخش خاں پر ان کا مضمون گویا ادائے قرض ہے جس میں انہوں نے خدابخش خاں کی عالمانہ، دانش ورانہ اور قانون میں ماہرانہ شان کو بڑے مدلل انداز میں بیان کیا ہے اور اس میں علامہ شبلی کے متعلق خدابخش خاں کے بڑے پُر اثر جملے بھی اس وقت کے آگئے ہیں جب علامہ شبلی کی جگہ حیدرآباد میں خدابخش خاں کا انتخاب کیا گیا تھا، آزاد بلگرامی، سید صدیق حسن خاں، عبدالعزیز میمنی، مولانا گیلانی، شاہ ولی اللہ اور ہندوستان میں خدمت حدیث کے تعلق سے مضامین قدر کے لائق ہیں اور بقول مقدمہ نگار مولانا سید محمد رابع ندوی یہ مفید اور لائق ستائش کوشش ہے۔

آقائے سخن وسیم خیرآبادی: از جناب فرید بلگرامی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۸۸، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: فرید بلگرامی، بلگرامی بلڈنگ، میاں سرائے، خیرآباد، سیتاپور یوپی اور عارف علی انصاری، لطیف مارکیٹ، خیرآباد، سیتاپور اور دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔

سیتاپور کا قصبہ خیرآباد ان بستیوں میں ہے جو واقعی اسم با مسمی ہیں، ایک ریاض خیرآبادی ہی اس کی مردم خیزی کے لیے کافی ہیں لیکن مولانا فضل حق خیرآبادی، رئیس احمد جعفری مضطر اور مائل خیرآبادی جیسے مشاہیر کے نام آبادی کے خیر ہونے پر مستزاد ہی کہے جائیں گے۔ یہ تو چند مشاہیر ہیں، ان کے علاوہ ایک اور کہکشاں بھی اس زمین کے آسمان کو روشن تر بناتی ہے جس میں حضرت وسیم غالباً سب سے نمایاں ہیں، امیر مینائی کے شاگرد اور فراق گورکھپوری کے استاد اور خود ریاض خیرآبادی کے مستشار کی حیثیت سے ان کی قدر و قیمت کا تعین مشکل نہیں، یہ اور بات ہے کہ ان کو وہ بال و پر نہیں ملے جس سے شہرت کو پرواز میں آسانی ہو، اس کتاب کے لائق مصنف نے جب وسیم خیرآبادی کے مطالعہ کو مقالہ تحقیق کا موضوع بنایا تو شاید اس وقت ان کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کس خزانہ علم و ادب کی دریافت کا غیر معمولی کارنامہ انجام دینے والے ہیں، جس شاعر کے شاگرد سینکڑوں کی تعداد میں ہوں اس کو واقعی یہ کہنے کا حق ہے کہ ع خدا بخشے کوئی ایسا سخن ور اب کہاں ہوگا۔ یہ احساس بھی بجا تھا کہ

کہتے ہیں نہ جو کہتا بے مثل وسیم اشعار آقائے سخن کیوں وہ مشہور ہوا ہوتا

لطف تو تب ہی ہے جب شاعر کو اپنی زباں کے اثر کا یقین ہو

اثر سا ہے اثر اس کی زباں میں وسیم ایک شاعر جادو بیاں ہے

یا یہ کہ تاثیر کس غضب کی ہمارے سخن میں تھی

فراق نے شاید استاد کی تعظیم میں دہلی کے ساتھ لکھنؤ کی جگہ خیرآباد کو دبستان قرار دیا، لیکن دبستان لکھنؤ کے عناصر میں داخلی جذبات کی جگہ معشوق کے خارجی اوصاف، رعایت لفظی، معاملہ بندی، نازک خیالی اور سب سے بڑھ کر زبان کی صفائی اور شستگی، اشعار کی روانی اور بندشوں کی چستی اور مضامین میں شوخی، رنگینی اور رعنائی کے جو اوصاف بیان کیے جاتے ہیں، وسیم صاحب کی شاعری میں ان کا ظہور ہی نہیں کامل ظہور ہے۔

سوراخ پڑ گئے میرے دل میں تہِ لحد کیں ٹھنڈی چوڑیاں جو مرے سوگوار نے

شام وصال تجھ کو لگائے ہیں چار چاند رنگ حنا نے غازے نے افشاں نے ہار نے

الفت میں زلف ورخ کی سپید و سیاہ دہر — دکھلائے مجھ کو گردش لیل و نہار نے

ہر گل بہار گل میں بنا ہے چراغ طور — اس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے

قتل ہونے نہ دیا اس کی نزاکت نے مجھے — رہ گیا اپنا سا منہ لے کے وہ قاتل میرا

لڑائی کفر و ایماں میں اگر ہو — تمہاری زلف اِدھر ہو رُخ اُدھر ہو

تجھے پامال کرنے سے غرض ہے — تری مہندی ہو ، دل ہو یا جگر ہو

لیکن کمال یہ ہے کہ اس رنگ کے ساتھ داخل جذبات کی کمی نہیں، عام روش لکھنؤ کے برخلاف غزلیں زیادہ تر مختصر ہیں جن سے خواہ مخواہ قافیہ پیمائی کے ابتذال سے حفاظت ہوتی جاتی ہے۔ یہاں وسیم کی شاعری پر تبصرہ مقصود نہیں ورنہ تفصیل سے بتایا جاتا کہ خمریات میں ریاض ہی نہیں وسیم بھی غرق ہیں، ممکن ہے آتش میں خواجہ حافظ کا جو جوش ہے وسیم میں کم ہو لیکن سرمستی میں وسیم، ریاض و آتش سے آنکھیں ضرور ملاتے ہیں۔ خوب ہوا جو لائق مصنف نے یہ سارا دستیاب کلام جمع کر دیا مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ مباحث ہیں جن میں وسیم صاحب نے اپنے تلامذہ کے کلام کی اصلاح کی ہے، یہ اردو کے سنجیدہ طالبوں کے لیے بار بار پڑھنے کے لائق ہیں، باقی اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو ایک تحقیق کے حسن قبول کے لیے ضروری ہے جیسے زبان دانی، قصیدہ گوئی، امیر اللغات ونور اللغات کی تالیف میں تعاون، صحافت، امیر و داغ، گلچیں، دامن گلچیں وتحفہ خوشتر کی بازیافت وغیرہ۔ گلچیں آج سے قریب سوا سو سال پہلے اس زمانہ کے لحاظ سے گلدستہ کی شکل میں ماہنامہ بن کر نکلا، جس میں مصرع طرح پر بیسیوں غزلیں ہوتی تھیں، کیا دور رہا ہوگا نظام دکن کا مصرع دیا گیا کہ ع یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

ریاض، حسرت، ثاقب، برق، تسلیم، عزیز، مضطر سب کی تضمینیں ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، وسیم نے بھی مصرع لگایا کرے گی چوٹ کس پر چھپ کے ظالم۔ یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

ایک اور بھی مصرع لگایا لیکن اس کا لطف براہ راست کتاب سے لیا جا سکتا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات اسی گلچیں کے ذکر سے ملی کہ اس میں جگر بسوانی کا ایک ناول درد جگر قسط وار شائع ہوا تھا اور "یہ دراصل جگر بسوانی اور عطیہ فیضی کے معاشقے کی داستان ہے"۔ اس انکشاف پر حضرت وسیم کا ہی ایک مصرع دہرایا جا سکتا ہے کہ ع کوئی ہماری طرح بھی گرمِ سفر نہ ہو۔ ایسی دلچسپ اور مفید کتاب کے لیے لائق مصنف ہر طرح مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتابت کے سہو و اغلاط کا ذکر اب کیا کیا جائے۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ: محمد عارف اقبال، اردو بک ریویو، ذیلی منزل نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت: ۵۹۵ روپے

۲-اقبالیات اور قرۃ العین حیدر: نسیم عباس چوہدری، اقبال اکادمی پاکستان، چھٹی منزل ایوان اقبال، لاہور۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۳-حسرت موہانی، حیات و خدمات: شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، ۲۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۴-داستان میری (جلد اول): مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ، نعیمیہ بک ڈپو، دیوبند۔ قیمت درج نہیں

۵-دیوان امداد امام اثر: سرور الہدیٰ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، ۲۔

قیمت: ۳۰۰ روپے

۶-سفرنامۂ برطانیہ (یعنی مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری کے سفر انگلینڈ کی روداد): بقلم پروفیسر محمد حسان خاں ندوی، مکتبہ دین و دانش، ۱۳۰/مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

۷-عرب و ہند کی علمی و ادبی خدمات (مجموعۂ مقالات) جلد اول: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، مرکز تحقیقات اسلامی، گلشن عتیق، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ۔ قیمت: ۱۴۱ روپے

۸-کلیات غزل......قبھا: ڈاکٹر راہی فدائی، ابوالحسان اکیڈمی، بنگلور۔ قیمت: ۴۰۰ روپے

۹-نقد غزل: ڈاکٹر تابش مہدی، انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

قیمت: ۱۵۰ روپے

۱۰-یگانۂ روزگار۔ مولانا عبدالسلام ندوی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی (رحمت نگر)، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے